مسلمان کیا کریں؟

حلقۂ ادب لکھنؤ

مسلمان کیا کریں

لوگ ما تسبیح لے کر مسجدیں آباد کر رہے ہیں
مسلمان ہونے کا [illegible] کر رہے ہیں [illegible]
[illegible] کیا ہم مسلمان ہیں؟
اقبال قریشی

حلقۂ ادب لکھنؤ

غریب مسلمانوں کے نام

پیش لفظ

جمود اور تعطل یا تھکے ہوئے جرنیلوں اور بہکے ہوے سیاستدانوں کی زبان میں "اصلاح اور تعمیر" کے دور میں قومی دماغ خودبخود اس طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ اب کیا کریں۔ جب تک لائحہ عمل متعین اور منزل مقصود سامنے ہوتے ہیں۔ قومیں غور و فکر کی زحمت گوارا کئے بغیر آگے بڑھتی جاتی ہیں اور اُن کے دماغ ان مصنوعی اصلاحات اور تعمیری الجھنوں میں نہیں پھنستے جن کی اساس شخصی مفادات اور خود غرضیوں پر ہوتی ہے لیکن جونہی عزم و ہمت میں سستی پیدا ہوتی ہے اور انقلابی تقاضے کسی وجہ سے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ شخصی خود غرضیاں اُبھر آتی ہیں۔ اور قومیں عارضی اصلاح و تعمیر کی طرف دوڑ پڑتی ہیں۔ بدنصیبی سے آج ہندوستان بھی اسی تباہ کن دور سے گذر رہا ہے۔ وطن کی انقلابی جماعتوں کے گرم اور تیز رجحانات مضمحل ہو رہے ہیں۔ آئین پرستی کی لعنت سوار ہے اور کل تک جو لوگ ملک کے انقلابی تقاضوں کے علمبردار تھے آج وہی حکومت و وزارت اور عارضی منصب و اعزاز کی دلدل میں پھنسے ہیں اور ملک کے رجعت پسند عناصر کو یہ موقع مل گیا ہے کہ وہ اپنے سامراجی مفادات کی خاطر اصلاح و تعمیر

کے پروگرام سامنے لا رہے ہیں اور یہ مفاداتی اور غیر انقلابی پروگرام طبعی طور پر ایک طبقہ کے لئے موجب طمانیت اور دوسرے طبقہ کے لئے باعث نقصان ہیں۔

ان اصلاحی اسکیموں کے خطرات ہندوستان کا تمام غریب طبقہ محسوس کر رہا ہے اور بالخصوص غریب مسلمان سخت خائف اور فکرمند ہے مسلمانوں کا ذہن فطری طور پر اس طرف متوجہ ہو رہا ہے کہ آئین پرستی کے دور میں اصلاح و تعمیر کے نام پر جو غیر سیاسی بلکہ استعماری تقاضے پیدا ہو رہے ہیں وہ ملک کی دوسری جماعتوں کے لئے مفید ہیں اور مسلمانوں کے لئے مضر، لہٰذا طبعی طور پر یہ سوال پیدا ہو رہا ہے۔ کہ مسلمان کیا کریں۔ سیاسی نظر اور سیاسی تربیت کی کمی نے مسلمانوں کو ورطۂ حیرت میں ڈالا ہے اور وہ کوشش کے باوجود یہ طے نہیں کر سکے کہ مسلمان ان نام نہاد اصلاحی اسکیموں اور استعماری تقاضوں کو فنا کرنے کے لئے کیا تدبیر اختیار کریں۔ یہ سوال درحقیقت نہایت اہم اور پیچیدہ ہے اور اس کا مستحق ہے کہ مسلمان غصہ نفرت اور تعصب سے الگ رہکر سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کریں اور اپنے لئے صحیح راہ متعین کریں۔

اس ضرورت کے پیش نظر حلقہ ادب نے ہندوستان کے مشہور مفکرین اور علمی سیاستدانوں کے افکار اس موضوع پر جمع کر کے ایک مجموعہ کی شکل میں پیش کئے ہیں اور اس امید پر یہ اقدام کیا ہے کہ مسلمان سنجیدگی کے ساتھ ان مضامین کا مطالعہ کریں اور ہر مفکر کے زاویۂ نظر کو اپنے ذاتی رجحانات سے علحدہ رہکر دلائل کی روشنی میں پسند یا ناپسند کریں۔

ح۔ م۔ ق

حلقۂ ادب۔ لکھنؤ

مسلمان کیا کریں

آجکل اخبارات نے ایک حل شدہ سوال کو نئے عنوان سے اٹھایا ہے تحریک خلافت میں اسلامیان ہند کے علم وعمل کی ساری قوتیں مجتمع ہو گئی تھیں کیا اس وقت اس سوال کو حل نہ کر دیا گیا تھا؟ انگریز سے ترک تعاون اور ابنائے وطن سے موالات، یہی ہماری حکمت عملی کا بھی مرکزی نقطہ تھا۔ اُس وقت سے لیکر اب تک انگریز اور ہندو کی خو بُو میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہندو پہلے بھی ایسا ہی تنگ دل تھا۔ اسی طرح انگریز بھی پہلے کی طرح اسلام کا دشمن ہے۔ اس لیے بحث کی بنیاد میں فرق نہیں آیا۔ بلکہ حالات میں فرق آیا ہے چنانچہ ماحول کے مطابق اپنے پروگرام میں جزوی تبدیلی کرنی چاہئے۔

ہندو اکثریت قدرتاً اپنے اقتدار کے گھمنڈ میں آ گئی ہے وہ کانگرس پر قابض ہے اور رہے گی۔ ہماری کوئی کوشش اس حقیقت کو بدل نہیں سکتی۔ اس دلیل پر پہنچکر علم وعمل کے دو منطقی راستے سامنے آتے ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے سے مخالف سمت میں جاتے ہیں کچھ مسلمان یوں سوچتے ہیں کہ ہم اگرچہ مستقل اقلیت میں ہیں لیکن ہندوؤں کے سیاسی گروہوں اور اقتصادی رجحانات سے فائدہ اٹھا کر ملکی سیاسیات میں نمایاں مقام حاصل کر سکتے ہیں! بشکل دیگر مسلم اقلیت کثیر تعداد میں کانگرس میں شامل ہو کر ہندوؤں کی غاصبانہ ذہنیت کو انصاف پسندی پر مجبور کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ مسلمان یوں قیاس کرتے ہیں کہ جب آئینی جماعتوں میں تعدادی

سب سے قوی اور فیصلہ کن دلیل ہے اور جب تک یہ پچھتر سے کم ہے تو کسی آئینی جماعت میں (جیسی کہ کانگریس ہے) ۲۵ فیصدی مسلمان ۷۵ فیصدی ہندوؤں میں شامل ہو کر وقت ضائع کیوں کریں۔ جب عددی اکثریت کے خلاف کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں تو انصاف حاصل کرنے کے لئے کانگرس کے پاس جانا سیاسی تاریکی میں ایک موہوم امید پر دلیرانہ طور پر چھلانگ لگانا ہے

دوسری طرف لیگ ہے جو گو بظاہر آزادی کامل کو اپنا نصب العین بتاتی ہے مگر عملاً اس بلندی سے لڑھک کر انگریز کی آغوش میں آجانا چاہتی ہے اور انگریزی فوج کے لئے بھرتی کو مستحسن قرار دیتی ہے ایک وقت شوق کی بلندی پاکستان کے خواب دکھاتی ہے اور دوسرے وقت ہمت کی پستی مولانا ظفر علی خاں کی طرح صاف کہہ دیتی ہے کہ انگریز کے تعاون پر قناعت بہتر ہے

تاہم لیگ کی پوزیشن قول و عمل کے اعتبار سے کتنی ہی مضحکہ خیز ہو لیکن اس میں کلام نہیں ہندو کی عددی اکثریت کو پیش نظر رکھتے ہوئے قدرتاً مسلمان یہی سمجھتا ہے کہ لیگ کے خدشات درست اور صحیح ہیں۔ یہ ایک سچائی ہے اور ہمیں چاہیے کہ جو کچھ بھی سوچیں اس سچائی کو سامنے رکھ کر سوچیں۔ دنیا کے ہر گوشے میں اقلیتیں اسی طرح متردد اور متشکک ہوتی ہیں خصوصاً وہ اقلیت جو ہندی مسلمان کی طرح سرمایہ سے بھی ایک حد تک محروم ہو اس کا سیاسی اعتبار سے خصوصیت کے ساتھ متفکر ہونا بالکل فطری امر ہے لیکن کانگرسی مسلمان جو عقلی طور پر برسر حق ہے قوم کے قدرتی خدشات کو نظر انداز کر کے چاہتے ہیں کہ کانگرس کے سرمایہ دارانہ بھیڑ بھڑکے میں غریب مسلمان گھٹ گھٹ کر کام کریں۔ جہاں میں لیگ میں عملی افلاس پاتا ہوں۔ وہاں کانگرسی مسلمان کو بھی اندھا دھند چلنے والا کہتا ہوں۔ وہ موٹر پر سوار ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ہوائی جہاز چلا رہا ہوں۔ راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ بیشک اس کی منزل مقصود واضح ہے لیکن راستے میں پہاڑ اور دریا حائل ہیں۔ ہوشیار انجینئر کا فرض ہے کہ نشیب و فراز پر نگاہ رکھے۔

خواہ پُرپیچ راہوں سے منزل مقصود تک پہنچے مگر کسی اندھے کوئیں اور گہرے غار میں گرے
کانگرسی مسلمان اصولی طور پر یہ کہتا ہے کہ آؤ کانگرس کی مشترکہ تنظیم میں شامل ہو کر اپنی
خدمت اور قربانی کے مطابق نمایاں ہونے کی سعی کریں۔ لیکن وہ غریب قوم کی مشکلات
پر غور نہیں کرتا وہ اس چیز کو بالکل بھول جاتا ہے۔ کانگرس کا سرمایہ دارانہ نظام اپنی تنگ دلی
و تنگ نظری کا اتنا مظاہرہ کرتا ہے کہ گویا عملاً کانگرس کے دروازہ پر "مسلمان کو اندر
آنے کی اجازت نہیں" کا بورڈ لٹکا ہوا ہے۔

اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار مسلمان تو لیگ کے پروپیگنڈا کا شکار ہو کر انگریز کے دامن
میں پناہ چاہتے ہیں۔ رہ گیا غریب مسلمان سو وہ حیرت سے کھڑا چیزوں کو دیکھتا رہتا ہے
اور کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ ہندو سرمایہ دار بڑی بڑی رقومات خرچ کر کے ہندو عوام
کو کانگرس میں شامل کر کے خود کانگرس کے عہدوں پہ قابض ہو جاتا ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں اپنا
تجربہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں بحث کو نبٹانے کے لئے گاندھی جی کے گذشتہ مضامین کا
حوالہ کافی ہے کہ کس طرح کانگرس کی ممبری پہ انفرادی سرمایہ خرچ ہوتا ہے جب ایک ہندو
سرمایہ دار دہ ہزار روپیہ خرچ کر کے بیس ہزار ممبروں کو خرید سکتا ہے تو قیاس کر لو کہ غریب مسلمان
کارکن کتنی محنت اور کتنے عرصہ میں ایک ہزار ممبر بنا سکے گا۔ اس لئے میں کانگرسی مسلمان کی
بیکسی کو سمجھتا ہوں جب وہ مسلمانوں کو کانگرس میں داخلہ کے لئے پکارتا ہے لیکن اس سرمایہ دارانہ
نظام میں مفلس مسلمان کے داخلہ کی مجبوریوں پہ غور کر کے اس کا مداوا ڈھونڈھنا اس کے
امکان سے باہر ہوتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ کانگرس نے اپنے مسلمان ہمدردوں کو کرکٹ کے کھیل کے لئے ٹینس
کا رکیٹ دیکر کھڑا کر دیا ہے۔ میں کانگرس کی مسلم ماس کانٹکٹ تحریک کو ریاکارانہ نہیں بلکہ طفلانہ

سمجھتا ہوں۔ اس کنٹیکٹ کے کارکنوں کو بغیر جال اور کانٹے کے مچھلیاں پکڑنے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ وہ علاقوں میں بڑی محنت کر کے ۵ ہزار مسلمان ممبر مہیا کرتے ہیں لیکن کانگرس کے ہندو سرمایہ دار گھر بیٹھے ہی روپیہ خرچ کر کے اس عرصہ میں اس سے دُگنے تگنے ہندو ممبر بنا لیتے ہیں۔ اس حالت میں چند فیصدی مسلمانوں کی صدائے لوطنی کانگرس کے نقار خانے میں کون سنے گا۔ کسی کانگرسی نے خاص کرم فرمائی کی تو ایک آدھ مسلمان کو عہدہ دیدیا ورنہ کھدر کا تھیلہ ہاتھ میں لٹکا کر مسلمان ورکر کے لئے سارے سال اِدھر اُدھر بیکار گھومنے کے سوا کیا چارہ ہے؟

اصولی اور عقلی اعتبار سے کانگرسی مسلمان کی پوزیشن بہت مضبوط ہے بلا شبہہ یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ مشترکہ سیاسی ذہن جو ملکی آزادی اور اقتصادی ترقی کا کفیل ہو بغیر مشترکہ تنظیم کے ناممکن ہے کانگرسی مسلمان جب ملت کو اس طرف بلاتا ہے تو لیگی مسلمان علم ہندسہ لیکر بیٹھ جاتا ہے۔ اقلیدس اور الجبرا کے تمام قاعدوں کی رو سے سمجھتا ہے کہ کانگرس کا رستہ تاریک غار کی طرف جاتا ہے۔ وہ جذبات کی چنگاریوں کو اخبارات کی مدد سے ہوا دیتا ہے مسلمان اپنے آپ کو عددی اقلیت میں پاکر قدرتی طور پر ادھر متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس کے پاس کوئی تعمیری پروگرام نہیں کیونکہ اس کا فلسفۂ زندگی ایک مایوس انسان کی وحشت ناک چیخ سے زیادہ کچھ نہیں جس کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اوروں کو بھی مایوس اور مغموم بنا دے مسلمانوں کی سیاست ان دو بحثوں میں الجھی ہوئی ہے ایک کے بانی کانگرسیا اصحاب ہیں اور دوسرے کے ارباب مسلم لیگ۔

لیکن چھوٹی چھوٹی الجھنوں سے الگ رہ کر جو پالیسی تحریک خلافت میں اسلام کے اعلیٰ مقصد کو پیش نظر رکھکر وضع کی گئی تھی۔ ہمارے خیال میں وہی بہترین پالیسی ہے علماء

اور احرار اسی سیاسی مسلک پر گامزن ہیں یعنی انگریز سے ٹکر اور ابنائے وطن سے موالات جب چھوٹی لڑائیوں سے نظر ہٹا کر اسلام اور وطن کے بلند مقصد پر غور کرو گے تو باوجود ہندو کی کمزوریوں کے عقل انہی سے نباہ کرنے کو کہے گی۔

تحریک خلافت خلیفہ کی معزولی سے مٹ گئی۔ لیکن احرار اور علماء اسی رویۂ عمل کے نتیجہ قائم مقام ہیں۔ ان کی مومنانہ فراست الگ تنظیم کی بھی قائل ہے۔ تاکہ اقلیت کے قدرتی خدشات کا بھی ازالہ ہو اور اگر اکثریت "دھکا شاہی" پر اتر آئے تو مقابلہ میں ایک مستحکم عسکری نظام بھی حفاظت کے لئے قائم رہے۔ لیکن احرار اور علماء کے علیحدہ نظام کا مقصد ہندو مسلمان کے اختلاف کو وسیع کرنا نہیں بلکہ دو قوموں کو قریب لانا ہے تاکہ وطن انگریز کے پنجہ سے آزاد ہو اور ممالک اسلامی کی مکمل خلاصی میں سہارا بہم پہنچیں۔ اس لئے احرار اور علماء باوجود کانگرس کی کمزوریوں کے اس کو فنا کر دینے کی ساعی نہیں۔ پس مسلمانوں کے لئے یہی راہ عمل ہے کہ وہ ایسا اسلوب اختیار کریں کہ جس سے حتی الامکان ملک کی مشترکہ تنظیم کو مدد پہنچے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو اس طرح مضبوط کرتے چلے جائیں کہ رجعت پسندی قوم میں پرورش نہ پا سکے اور نہ ہندو اکثریت کا انھیں خوف دلایا جا سکے۔

خیال کی صحت سے عمل استوار ہوگا۔ بودی بنیاد پر عمدہ عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ کانگرسی مسلمان کا اصول ٹھیک ہے۔ لیکن عمل میں مشکلات ہیں۔ عملی مشکلات کو رفع کرنے کے لئے مجلس احرار ہے۔ جس کے پشتی بان علماء ہیں اس بحث میں علماء اور احرار کو الگ کرنا واقعات کو غلط رنگ دینا ہے۔ مجلس احرار اور جمعیت علماء ہند کے گہرے اشتراک عمل پر اصرار کیا جانا چاہئے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ جماعتیں صرف اصلاحی طور سے

الگ ہیں ورنہ حقیقت میں یہ دونوں جماعتیں ایک ہی جذبہ صادقہ سے پرورش پا رہی ہیں اور وہ جذبہ ملک کی بہتری اور اسلام کی بہبودی کا جذبہ ہے۔

لیگ کے حامی حضرات علماء اور احرار کے ایثار کو تو مجبوراً تسلیم کرتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ لیگ کے نظام کی وسعت کے مقابلہ میں احرار اور علماء کا دامن تنگ ہے حالانکہ لیگ کسی نظام کا نام نہیں ہے بلکہ ایک تخیل کا نام ہے جو چند افراد کی قوت واہمہ کی تخلیق ہے یہ گی بہت ہیں لیگ کہیں نہیں ہے۔ جماعتیں ایثار سے بنتی ہیں اور اسی دولت سے ارباب لیگ محروم ہیں۔ جب ان میں ایثار آجائیگا تو احرار بنجائیں گے۔ سارا جھگڑا عمل اور بے عملی کا ہے جیل جاکر ہر ایک کو ہوش آجاتا ہے کہ وطن کی آزادی سب سے اہم فرض ہے اور انگریز کی کمزوری میں اسلام کی سیاسی قوت کا راز مضمر ہے جنہیں یہ سمجھ ہے وہی احرار کی فوج کے سپاہی اور علماء کے عقیدتمند ہیں۔ یوں کہنے کو کہو تو میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ ہر بے عمل مسلمان وکیل کا گھر اور سرکاری ملازم اور سرمایہ دار کا بنگلہ مسلم لیگ کا دفتر ہے لیکن ہم اس قسم کی عارضی تحریکات اور اُن کے عارضی ہنگاموں کو اہمیت نہیں دیتے مسلمان بگولے کی طرح اٹھتا ہے اور غبار کی طرح بیٹھ جاتا ہے وہ تو کچی میوہ سمجھ کر ہر نئی تحریک کی طرف رغبت کرتا ہے۔ پھر جلد ہی دانت کھٹے ہو جاتے ہیں اور وہ اُکتا کر اس میوہ کو پھینک دیتا ہے" ڈاکٹر کچلو کی تنظیم اٹھی ہاتھیوں پر جلوس نکلے۔ اسلامی ہند میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اسی کے کھنڈرات پر قریشی صاحب نے سیرت کی عمارت تیار کی۔ دو دن لوگ اسی کو جائے پناہ سمجھا پھر سید غلام بھیک نیرنگ نے تبلیغ کا علم بلند کیا، لوگوں نے اسی کے سایہ میں سمٹ آنے کی سعی کی۔ کیا یاد نہیں کہ مسلم کانفرنس نے کتنی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ وہ اہمیت تو ابھی لیگ نے اختیار نہیں کی۔ اس بیچاری کا تو آرمی بل نے کب کا

جنازہ نکال دیا اور جو رہا سہا وقار رہ گیا تھا وہ مس جناح بطور جہیز کے ساتھ لے گئی۔

رہ گئی کانگریس، سو میں کہتا ہوں کہ وہ شوق سے اپنے دروازے بند رکھے ہم اپنی تعمیر اور تنظیم کے لئے کانگرس کی توجہ کے ایسے محتاج نہیں کہ کانگرس لیگ کو تسلیم کرے تو مسلمان زندہ ہے ورنہ اسلام خطرہ میں ہے مجلس احرار شمالی ہند میں مضبوط ترین جماعت ہے ایثار اور قربانی کے لحاظ سے کوئی اسلامی جماعت احرار اور جمعیتہ علماء کے پاسنگ نہیں ہے اسلئے وقت کی پکار یہی ہے کہ جمعیتہ علماء اور احرار جو آئندہ ایک جماعت کے طور پر کام کرنے کا عہد کر رہے ہیں۔ اس کو مسلمانوں کے لئے فال نیک سمجھا جائے۔ اور ان سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ خدارا لیگ کے امیروں، انگریز کے سیاسی ایجنٹوں اور اس کے فوجی افسروں کے ساتھ دے کر قوم کو انگریز کے قدموں میں ڈال دینے میں ممد و معاون بننے کے بجائے ایثار پیشہ احرار اور علماء کے ساتھ مل کر دین و دنیا میں سرخروئی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

کانگرس کے اندر ہو یا باہر لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرو کہ برطانوی ملوکیت کا قصر رفیع اسلامی سلطنتوں کے کھنڈرات پر تعمیر ہوا ہے۔ ہمیں کانگرس سے چھوٹی لڑائیاں لڑنے کے بجائے اندر داخل ہو کر یا باہر رہ کر برٹش امپیریلزم کے خلاف محاذ کو مضبوط کرنا ہے جوں جوں یہ محاذ مضبوط ہوگا اسی قدر انگریز کی گرفت اسلامی ممالک پر ڈھیلی ہوگی انہیں یہ خوف ہے کہ کانگرس مضبوط ہو رہی ہے۔ یہ بھی غور کریں کہ اسی تناسب سے انگریزی جبروت سے خائف دنیائے اسلام بھی آزادی کا سانس لے رہی ہے۔ ہندو ضرور بعض جزوی فوائد حاصل کر رہا ہے۔ کرنے دو۔ ان جزوی فوائد کے مقابلہ میں دیکھو تو سہی ہندوستان کی سرحدوں کے قریب کیا ہو رہا ہے۔ دنیا کا مسلمان نہ صرف کروٹ بدل رہا ہے بلکہ لاہور سے استرخان تک ایک ہی جذبہ آزادی سے سرشار ہے۔ پاکستان کی فضول بحث میں نہ پڑو۔ انگریز سے گلو خلاصی

کراؤ۔ جو قوم ہندوستان کا فوجی دروازہ روکے کھڑی ہے اُسے کوئی خطرہ نہیں، پنجاب، سندھ سرحد اور کشمیر، جہاں مسلمانوں کی بے پناہ اکثریت ہے۔ ہندوستان کی سیاسیات میں ناقابل انکار اہمیت کے مقام ہیں۔ ہندو آزادی کی طرف جتنے قدم بڑھے گا۔ اُسے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنا پڑے گا۔ غیر مطمئن مسلمان اسے قدرتی خطرات میں ڈھکیلنے کا باعث بن سکتا ہے اس لئے مسلمان کو چاہئے کہ کسی خوف کی بنا پر انگریز کی قوت کا ساتھی نہ ہو اور اُس اسلامی تنظیم میں شامل ہونے کی کوشش کرے جو ایثار اور قربانی کی بنا پر قائم ہے۔ جس کی محض زبان پر اسلامی تہذیب اور تمدن کا نام نہیں بلکہ جو دل سے اسلام کی فوقیت کی قائل اور شریعت پر عامل ہے۔ وہ احرار اور علماء کی اسلامی تنظیم ہے یہ سچ ہے کہ احرار اور علماء کے پاس نشر و اشاعت کے سامان مہیا نہیں۔ لیکن کیا محض اس قدر کی بنا پہ ایثار و قربانی کو سرمایہ کے تابع کر دیا جائے؟ احرار اور علماء کو آج اسی سرمایہ کا تابع کرنے کے لیے لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے۔ حالانکہ حق یہ ہے۔ کہ سرمایہ دار کو خلوص کی تابعداری کے لئے بلایا جائے اور کہہ دیا جائے کہ جو احرار اور علماء کے ساتھ نہیں وہ حق اور انصاف کا ساتھی نہیں۔ لیگ اور احرار کا مختلف نظام دراصل خلوص اور سرمایہ کا جھگڑا ہے جو لوگ احرار اور علماء کو چھوڑ کر مسلمانوں کو لیگ کی طرف بلاتے ہیں اور علم و اخلاص کو چھوڑ کر سرمایہ کے سنہرے جال میں نادانستہ پھنسے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ ہرگز نہ ہوگا خلوص کربلا میں ذبح ہونا قبول کرے گا۔ لیکن سرمایہ کی اطاعت قبول نہیں کریگا۔

میں اس واضح سوال کے جواب میں میرا واضح جواب یہ ہے کہ مسلمان ہر حال میں احرار کی تنظیم میں شامل ہوں تاکہ اقلیت کو کوئی امکانی خطرہ نہ رہے۔ مگر کانگرس کے خلاف محاذ نہ بنائیں بلکہ اچھی دلیلیں دے کر اس سے یہ مطالبات منوائیں۔

(۱) کراچی رزولیوشن کی روشنی میں مسلمانوں کے پرسنل لا کا بذریعۂ قانون کے تحفظ

(۲) ایسی فیڈریشن میں جس میں ریاستیں شامل ہوں مسلمانوں کے موجودہ تناسب کو قائم رکھنا

(۳) موجودہ کانگریسی نظام میں سرمایہ کا عنصر ختم کرنا اور آئندہ نظام حکومت میں سرمایہ داری کے نظام کی بنیادوں کو بدلنا۔

(۴) آئندہ نظام حکومت میں خارجہ حکمت عملی کو اسلامی سیاست کا زیادہ پیرو بنانا

اس کے علاوہ اور بہت سی ضمنی شکایات پیدا ہو سکتی ہیں اور وہ جزوی توجہ سے رفع بھی ہو سکتی ہیں۔

احرار کے سوا ہر طبقہ کے مسلمان کے دل میں یہی الجھن ہے کہ مسلمان کیا کریں میری مختصر درخواست ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کے ادغام کلی اور مسلم لیگ سے اجتناب کلی دو انتہائی نظریوں کے درمیان مجلس احرار ایک اعتدال کی راہ ہے۔ ہم ان شرائط کے ساتھ مشترکہ سیاسی تنظیم کے قائل ہیں لیکن مشترک تہذیب کی کوشش اور کاوش ہمیں ناپسند ہے۔

اب معترض فوراً بیتاب ہو کر پوچھے گا کہ اگر کانگریس احرار کے مذکورہ شرائط سے اتفاق نہ کرے تو کیا احرار کو لیگ کا طرز عمل اختیار کرنا پڑے گا ہم جواب دیں گے کہ نہیں۔ اول تو یہ مطالبات موجودہ آئین کی اس بنیاد پر قائم کئے گئے ہیں جو متفق علیہ ہے۔ کراچی کانگرس کے ریزولیوشن میں مسلمانوں کے پرسنل لا کی حفاظت کا یقین دلایا گیا ہے۔ قاضیوں کا تقرر اس لفظی قرارداد کی عملی شکل ہے۔ پھر ہم کسی اور قوم کے لئے ایسے تحفظ کے خلاف نہیں ہیں کہ کوئی ہم پر اعتراض کر سکے۔ مرکزی اسمبلی میں موجودہ آئین ایک تہائی ممبر مسلمان ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی صورت میں اس بنیاد کو نہ بدلا جائے۔ یہ مطالبات درحقیقت مطالبات

نہیں بلکہ متفقہ طور پر تسلیم شدہ اصولوں کی توضیح و تشریح ہے۔

لیکن صرف ان ہی مطالبات کی بحث کا کیا ذکر ہے اور بھی بیسیوں الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں ان کے حل کے لئے مسلم اقلیت کو احرار اسلام کے عسکری نظام کی ضرورت ہے۔ جو نہ صرف کانگریس کے مطالبۂ آزادی میں ممد و معاون ہو بلکہ مشترکہ سیاسی تنظیم میں شامل ہو کر قربانی اور ایثار میں سب قوموں کی سرداری کرے۔ اور اپنے مقام پر اپنے نظام کی خوبی کے باعث مطمئن ہو کہ اس کی ہستی کو کوئی خطرہ نہیں۔

راقم الحروف کو یہ یقین ہے کہ ایک عالمگیر جنگ کے بعد ہندوستان کی سیاسیات کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ اور زیادہ سے زیادہ دس برس کے اندر کانگرس مسلمانوں کی آزاد سلطنتوں کے قرب کے باعث نہ صرف مسلمانوں کو ہر قسم کی رعایت دیگی بلکہ خود ہندو مسلمانوں سے تحفظ کا یقین چاہے گا۔ لاہور سے استرخاں تک ننانوے فیصدی اسلامی آبادی سے مہاسبھا کی مہربانی کے باعث ہندو اسی طرح خائف ہو جائیگا جس طرح آج لیگ کی خاص توجہ سے لاہور سے لنکا تک کی ۷۵ فیصدی ہندو آبادی سے مسلمان لرزہ براندام ہے شاید اس سے بھی کم مدت کے عرصہ میں، سندھ، سرحد، کشمیر، بلوچستان اور پنجاب کے مسلمان لیڈروں کو گلے پھاڑ پھاڑ کر اہل وطن کو یقین دلانا پڑے کہ خدا کے فضل سے ہماری نیتوں میں کوئی فساد نہیں۔ احرار کی یہ علیحدہ تنظیم اس وقت تک کے لئے لازمی اور لابدی ہے جب تک مسلمان بے ضرورت خطرہ محسوس کر کے خواب پریشاں میں مبتلا ہے اور مفت خور مشورہ دینے والے امیروں کے پھندے میں پھنسا ہوا ہے۔

"چودھری افضل حق" لاہور

مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو باضابطہ دعوت دی ہے کہ وہ اس بحث
پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ مجھے ذاتی طور پر شبہ ہے کہ اخبارات کے یہ مباحث
واقعی صحیح رائے یا کسی رائے کے قائم کرنے میں بھی کوئی وقیع مدد دیں گے۔ اسلامی اخبارات
کے نامہ نگار زیادہ تر ان سماجی طبقوں کے لوگ ہوتے ہیں جنہیں محنت مزدوری اور سنجیدہ
عملی سیاست سے لگاؤ نہیں ہوتا اس لئے اکثر اوقات یہ بحث ایک ادنیٰ درجہ کی مرثیہ خوانی
ہو کر رہ جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے آج سے نہیں بلکہ تقریباً ۲۵ سال سے صرف مسلمان
کی حیثیت سے اس سوال پر سوچا ہے اور کافی حد تک عمل بھی کیا ہے لیکن اگر ہم گذشتہ
تجربوں کو اپنے سامنے رکھیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں
(یعنی جب تک برطانوی استعمار کا قدم ہے) مسلمانوں کا کوئی جداگانہ سیاسی مسلک نہیں ہو سکتا
یہی وجہ ہے کہ بجز "خلافت" کی تحریک کے جملہ سیاسی اسلامی تحریکیں ناکام رہی ہیں۔
مسلم لیگ سے بہت پہلے اور غالباً زیادہ صحیح جوش اور بہتر لوگوں کی نگرانی میں تنظیم اور جمعیت
احرار کی تحریکیں ہو چکی ہیں لیکن نتیجہ ظاہر ہے مسلمانوں کی سیاسی تحریک بنیادی طور پر اقتصادی
اور انقلابی سوالات سے مخاطب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ یہ سوالات ہر ایک مسلمان کی
زندگی کے لئے نہیں بلکہ صرف محنت کش طبقہ کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں اور عمل کے

اعتبار سے محنت کش مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر تدابیر اور پروگرام سوچنے کے
لئے مجبور رہیں۔ ایسی صورت میں انقلاب کے لئے اسلامی جماعت کا سوال پیدا نہیں ہوتا
یہ حالت موجودہ "اسلامی سیاست" کسی اسلامی جذبہ یا تقاضہ سے نہیں۔ بلکہ
جداگانہ انتخابات اور عہدوں اور محدود بلکہ رجعت پسند مفاد کی حفاظت کے خیال سے
پیدا ہوتی ہے چنانچہ تھوڑی مدت بعد یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ لیڈروں کا مدعا
کچھ تھا، بھولے بھالے مسلم عوام کچھ اور سمجھے بیٹھے تھے نئی اصلاحات کے نفاذ کے بعد اور اس
آئینی دور میں سیاست کا منشا اس کے ماسوا اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا میں سمجھتا ہوں۔ کہ
ہماری ترقی پسند اسلامی سیاست کی پہلی اور آخری مثال تحریک خلافت تھی اور اُسکی
کامیابی کی بھی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ انقلابی جدوجہد کے دور میں پیدا ہوئی۔

.... اور قومی جدوجہد سے وابستہ ہوگئی۔ آخر بانئے خلافت
تو کل تک بقید حیات تھے سنہ ۱۹ء کے شوکت علی اور سنہ ۳۸ء کے شوکت علی میں جو فرق
وہی بنیادی طور پر اُس وقت کے اور اب کے تاریخی تقاضہ کا فرق ہو۔

ایسی صورت میں میرا پختہ عقیدہ تجربہ کی بنا پر یہ ہے کہ ہمیں جداگانہ اسلامی سیاست
سے ہمیشہ کے لئے توبہ کرلینا چاہئے یہ عقیدہ غیر تاریخی اور فاسد ہے چنانچہ اس سے کوئی
نتیجہ اور عام مسلمانوں کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس وقت بھی مسلم لیگ کا کانگریس
سے مفاہمت پر بار بار اصرار اس کی دلیل ہے کہ مسلمان اور ہندو عوام سیاسی اشتراک
کے لئے مجبور رہیں۔ عوام کا تقاضہ مفاہمت نہیں بلکہ مشترکہ انقلابی عمل ہے اس لئے مسلم
عوام ان محدود مفاد کی مصلحتوں اور مفاہمت کے مطالبہ کو اپنا نہیں سکتے۔ یہ بھی واضح
طور پر نظر آرہا ہے کہ علاوہ اور باتوں کے مسلم لیگ کا مفاہمت سے منشا یہ ہے کہ کانگریس کی

قوت جد و جہد کو مضمحل کر دیا جائے۔ آئینی کارروائیوں اور وزارتوں کا دائمی طور پر پابند بنا دے اور مسلم لیگ کے پردے میں ہندو مسلم جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو ملا کر اشتراکی لوگوں اور انقلاب پرستوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ کی مفاہمت کی بنیاد جد و جہد نہیں بلکہ تقسیم در حقوق، ہے اور گفتگو جواہرلال سے نہیں بلکہ مہاتما گاندھی سے ہوتی ہے حقوق سے مراد تحفظ مفاد ہے جن کے خلاف عوام جد و جہد کرنے والے ہیں۔

لیکن قارئین کرام کہیں گے کہ کانگریس میں متعصب ہندو جو بھرے ہوئے ہیں اور آئے دن اُردو سے دشمنی کا اظہار جو ہوتا رہتا ہے، ایسی صورت میں ایک اقلیت کے ارکان کا کانگریس میں شامل ہونے سے فائدہ؟ میرے نزدیک جو لوگ سوال کو اس نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ ظواہرات میں پھنسے ہوئے ہیں اور سیاسی حقائق سے بہت دور ہیں کیا آپ کا خیال ہے کہ وزارتیں محض اس لئے قبول کی جاتی ہیں کہ ہندی زبان اور ہندو کلچر کو فروغ دیا جائے، حکومتیں اپنے دائرہ عمل میں بہت محدود ہوتی ہیں۔ اور ہر نوع ایک قوم کی زبان یا تمدن کے بنانے یا بگاڑنے میں بہت کم حصہ لے سکتی ہیں خود اس بناؤ بگاڑ کے لئے بھی ضروری ہے کہ حکومت سے پہلے اور عام زندگی میں ایسے عناصر موجود ہوں۔ جن کی بنیاد پر سماجی اصلاح یا سماجی تخریب کا کام کیا جائے۔ موجودہ نظام حکومت میں لسانی اور تمدنی پہلو زیادہ سے زیادہ پردہ کا کام دیتے ہیں حقیقتیں خالصتاً سیاسی اور اقتصادی ہیں۔ حکومت بنیادی طور پر اس سوال سے بحث کرتی ہے کہ محاصل کون اور کتنی مقداریں ادا کرے؟ اور نظام حکومت کس طبقہ کی حمایت میں کربستہ رہے حکام وقت یعنی بااقتدار سماجی طبقہ پولیس۔ فوج اور عمال ان حکومت سے یہی کام لیتا ہے کہ اپنے

مفاد کو فروغ دیکر حکومت کا بار دوسروں پر ڈالتا ہے یہی بنا سیاسی جد وجہد کی ہے۔

آج کانگریس میں بنیادی کشمکش اور ہندو مسلم سوال سے کہیں زیادہ فیصلہ کن اور سنگین سوال یہ ہے کہ کانگریس کو ہندوستانی عوام یعنی کسان مزدور اور عام چھوٹی حیثیت کے لوگوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے بنایا ہے اور اس کی وزارتوں سے سرمایہ دار اور تعلقدار اپنے مفاد کی حفاظت کرانا چاہتے ہیں۔ کانگریس کی برسر اقتدار جماعت میں وہ رجحانات موجود ہیں جو کسان مزدور کی جد وجہد اور انقلاب سے بچنا چاہتے ہیں چنانچہ ہر قدم پر وزارت عوام کی جد وجہد کو بڑھنے سے روکتی ہے۔ اور کم از کم انقلاب پسندوں کی نگاہ میں اس کی کارروائیاں تشفی بخش نہیں ہیں۔ عوام نے ہندی اردو کی حفاظت یا موجودہ کلچر کے بچاؤ کے لئے قربانیاں نہیں کیں تھیں وہ اپنے اقتصادی بوجھ ہلکے کرنا چاہتے تھے ان کے سوالات اسلامی یا ہندوانہ نہ تھے وہ خالصًا انقلابی تقاضہ سے ملک کو آزاد کرنا چاہتے تھے اور آئندہ چل کر آزاد کریں گے

آج کی فرقہ وار بحثوں میں حصہ لینے والے کتنے ہیں جنھوں نے عوام کے ساتھ کانگریس کی لڑائیوں میں قربانیاں کی ہیں۔ ایک اوسط درجہ کا شہری مسلمان اس سوال کی صحیح صورت نہ سمجھنے کی وجہ سے بدحواس ہونے لگتا ہے غیر سیاسی مزاج اور سیاسی ناتجربہ کاری اُس کی راہ میں حائل ہیں۔ ورنہ اس کے دیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہے کہ ہندی اور ہندو دھرم کا نام لینے والے درحقیقت جاگیرداری اور سرمایہ کے محافظ اور خود ہندو عوام کے مخالف ہیں ورنہ دھرم اور ہندی کی یہ حالت نہ ہوتی۔ جو اس وقت ہر عوام اس سنسکرت آمیز ہندی کو نہ سمجھ سکتے ہیں۔ نہ موجودہ جارحانہ ہندی تحریک کا منشا ہے کہ یہ عوام کی زبان ہو حقیقت میں آج کی ہندی تحریک یہ زبان ایک ایسے سماجی طبقہ

کے لئے بنارہی ہے جس کے لئے تاریخ نے پہلے ہی سے تابوت بناکر رکھ لئے ہیں۔ اگر عوام کی زبان اور انقلابی خیالات رائج کرنا ہیں تو اس میں تعصب اور اُردو کی مخالفت کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔

بہرنوع کانگریس چونکہ "قومی جماعت" ہے یعنی ان سب طبقوں پر مشتمل ہے جن کے مفاد برطانوی استعمار سے متصادم ہیں۔ اس لئے ہم اس تحریک کو نہ روکنا چاہتے ہیں۔ نہ ہندی پرچار ہمارے بنیادی سیاسی مقاصد کے خلاف ہے۔ یہی حال فارسی اور عربی آمیز اُردو کا ہے۔ میرا نظریہ دونوں پر مساویانہ طور سے منطبق ہوتا ہے میرے مافی الضمیر کے لئے اُردو یا ہندی کی نہیں بلکہ ہندوستانی کی ضرورت ہے

لیکن بڑی خوشی یہ ہے کہ اس موجودہ اختلاط انگیز "صلح پسندی" کے زمانہ میں بھی ابھی کانگریس پر جاگیر پرست ہندی نوازوں کا اتنا قبضہ نہیں ہے جیسا کہ مسلمانوں کو آئے دن ڈرایا جاتا ہے۔ کل کا دن ہے کہ میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں اس بحث کو کانگریس کی تاریخ میں پہلی بار چھیڑا۔ میں نے اس کی مطلق کوشش نہیں کی کہ تجویز پاس ہوجائے انتہا یہ ہے کہ جنوب اور گجرات یا بنگال کے مندوبین کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ بحث کیا ہے اور یاں ہمہ ۶۳ رائیں موافق اور ۱۰ رائیں خلاف آئیں۔ یہ ایسی حالت میں ہوا کہ کانگریس میں مسلمان برائے نام ہیں اور استعمار دشمن جنگ سامنے نہ ہونے کی وجہ سے آج اوسط درجہ کا کانگریسی ترقی پسند اور رجعت پسند سماجی تحریکوں میں فرق نہیں کرتا۔ کل جب جدوجہد ہوگی صرف یہی نہیں کہ ہندی اُردو کی بحث ختم ہوجائیگی ہندو ہمارے ساتھ جیل جاکر ہم سے اُردو ہی نہیں بلکہ مذہب اسلام اور تاریخ اسلام سیکھیں گے اور ہم انسے کانگریس کا تاریخی خمیر جیلوں میں اور جدوجہد کے زمانہ میں بنا ہی مگر اس وقت

کانگریسیوں کے ساتھ یہ اُردو کے حامی اور ہندو تعصب کی شکایت کرنیوالے کتنے ہونگے؟

اس کے علاوہ آج کانگریس میں سوشلسٹ خیالات تیزی کے ساتھ پھیل رہے ہیں اور اشتراکی کے نزدیک ہندوستانی کی ہندو اور مسلم یا ہندی اور اُردو خوانی کی حیثیت مطلق اہمیت نہیں رکھتی۔ بلکہ استعمار دشمن صلاحیت اور مزدور کسان کی حمایت کا جذبہ ہی اُن کے نزدیک اہمیت کے قابل ہے اور بس!

غرضکہ کانگریس کو اس آئینی اور صلح پسندی کے مرحلہ میں جاید اور عقیم سمجھ کر بددل ہو جانا سیاست سے ناواقفیت اور تاریخی تنگ نظری کا ثبوت ہے جب تک کانگریس ہمارے ملک کی واحد قومی اور استعمار دشمن جماعت ہے۔ کانگریس سے منھ موڑنے کے معنی استعمار دشمن جدوجہد سے انکار کرنے کے ہیں اور مسلم لیگ اور مسلم جماعتوں کی تاریخ اس کا ثبوت ہے۔ سامراجی حلقے اس جدوجہد کو کمزور کرنے کے لئے اُن اسلامی رجحانات کو اُبھار رہے ہیں۔ اسی ابھار کے لئے انھوں نے شاطرانہ طور پر جداگانہ قیام ہیں اور حلقہ ہائے انتخاب قائم کئے تھے۔ اور یہ سب ادارے اس وقت وجود میں آئے تھے جب ہم ۱۸۵۷ء میں ناکام ہو چکے تھے اسلامی حکومت سے بے دخل ہو چکے تھے۔ حتی کہ حضرت مولانا اسمٰعیل رح شہید کا جہاد بھی بے اثر ثابت ہو چکا تھا یعنی اسلامی سیاست کا تاریخی دور اپنا کام ختم کر چکا تھا اور ہمیں استعمار دشمن اور قومی سیاست کی ضرورت لاحق ہوئی۔

غرضکہ میری نگاہ میں آج بھی باوجود سب تعصبوں کے صرف کانگریسی ہندو اس قابل ہیں کہ ہم اُن سے سیاسی اشتراک کریں

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دنیا میں سیاسی تنظیم کے علاوہ ملت کے لئے اور کوئی شیرازہ بندی درکار نہیں ہے یا مسلمانوں میں کوئی اصلاحی کام ہی نہ کرنا چاہیئے

واقعہ یہ ہے کہ قوموں کی سیاسی صلاحیت بڑی حد تک ان کی معاشرتی شیرازہ بندی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی تنظیم کی بدولت ہم نے کسی حد تک ۱۸۵۷ء میں مقابلہ کیا۔ اور اسی کے بل پر ہم انقلاب کر سکتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ کانگریس کو واحد سیاسی جماعت ماننے کے بعد ہمیں پہلی فرصت میں مسلمانان ہند کو ایک مرکز پر جمع کرنا چاہیئے تاکہ اپنی قوم سے جہالت، فضول خرچی، نفرت، مقدمہ بازی، مذہبی تنازعے اور لاابالی پن کا ادبار دور کریں۔ آج ہندوستان کو اس کی ضرورت ہے کہ ہر ہندوستانی خوددار۔ جفاکش، باخبر اور استعمار دشمن ہو۔ کانگریسی حکومتیں اپنے حدود میں سرگرم ہیں لیکن ظاہر ہے۔ کہ انقلاب سے پہلے حکومت کا کوئی ہمہ گیر پروگرام ممکن نہیں ہے۔ ہم مدارس شبینہ کے ذریعہ اپنے غریب کسانوں اور مزدوروں کو پڑھا کر ملک میں مدد کر سکتے ہیں۔ امداد باہمی کی انجمنیں بنا کر کسی حد تک سود خوار مہاجنوں کی لعنت سے مسلمانوں کو بچا سکتے ہیں اگر اردو سے ہمیں واقعی محبت ہے تو اُسے بڑھا سکتے ہیں۔ مذہبی اوہام اور شرک اور بت پرستی کی عادات و رسوم دور کر سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ کام ملت کی اصلاح کے ہی نہیں بلکہ وسیع معنی میں وطن اور استعمار دشمن جدوجہد کی ترقی کو بھی بڑھاتے ہیں۔ آج جوش بھی ہے کام کرنے والے بھی ہیں ضرورت بھی ہے صرف ایک مرکز کی ضرورت ہے

میرا جی چاہتا ہے کہ میں جملہ اسلامی مجالس سے اپیل کریں کہ خدا کے لئے نفسی نفسی اور انجمنوں کے مفاد کو چھوڑ کر ایک بار کسی مقام پر جمع ہو کر سوچو کہ مسلمانوں کی تنظیم کے کون کون سے کام ممکن العمل ہیں اور ان کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اگر سب مل کر اور ذمہ دارانہ طور پر اعلان کر دیں کہ وہ آج ہی ہندو اور انگریز دونوں سے لڑنے اور اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے تیار ہیں تو مجھ جیسے

بہت سے کانگریسی مسلمانوں کو اس کی شرکت میں بھی تامل نہ ہوگا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ خلوص اور یکجہتی سے اور عوام کے مفاد اور سیاسی حقائق کو ذہن میں رکھکر فیصلہ کیا جائے۔ مجھے خوف ضرور ہے کہ اسلامی انجمنیں اور لیڈر اس تجویز کو پسند نہیں کرینگے اس لئے کہ ملت اور تمدن اور لسانی اور مذہبی تحفظات کے بلند بانگ دعووں سے بلند تر ہر سیاسی جماعت کے اپنی ذاتی اور طبقاتی مفاد ہی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ملی وحدت اور تعمیری کام بے معنی خواب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ خوف مجھے اور بھی مجبور کرتا ہے کہ میں کانگریس کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہوں۔ اشتراکیوں کے ساتھ کام کروں اور فضول زبانی جمع خرچ سے احتراز کروں۔

کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون (قرآن)

ڈاکٹر۔ اشرف (پی۔ ایچ۔ ڈی)

مسلمان کیا کریں؟ دیکھنے میں تو اس سوال کے جواب میں بہت زیادہ گنجائش اور وسعت ہے لیکن درحقیقت اب اس کا میدان بہت زیادہ تنگ اور محدود ہوچکا ہے۔ یہ اب محض اس سوال کی تمہید ہو کر رہ گیا ہے کہ مسلمان کانگرس میں شامل ہوں یا مسلم لیگ میں۔ مانا کہ ملک میں مسلمانوں کی دوسری سیاسی اور مذہبی جماعتیں بھی ہیں جو کانگرس کے بنیادی اصول مشترکہ قومیت اور آزادی وطن کو بھی اپنا نصب العین بناتی ہیں اور مسلم لیگ کے بنیادی اصول مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کی بھی قائل ہیں لیکن ملک کی سیاست تیزی کے ساتھ اس غیر جانبداری کے دور کو ختم کر رہی ہے اور ہم اس قسم کی متزلزل بنیاد پر مستقبل کی کوئی پائیدار اور مستحکم عمارت نہیں تعمیر کر سکتے۔

کانگرس اور مسلم لیگ کے متعلق جو بحث اٹھائی جاتی ہے اس میں زیادہ تر دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں پڑ کر ہم بنیادی اور اصلی باتوں کو فراموش کر دیتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے ہیں۔ صرف بنیادی اور اصلی باتوں ہی کو پیش نظر رکھنا چاہیئے تب ہی ہم اس بحث سے کوئی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

پہلے میں مسلم لیگ کو لیتا ہوں۔ اس جماعت میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ کہاں تک مسلمانوں کی خدمت کر سکتی ہے اس جماعت کے خلاف

ہیں اس اعتراض کو زیادہ وزنی نہیں سمجھتا کہ اس کے لیڈر مسٹر جناح ہیں یا اس کے ارباب
بست وکشاد میں نوے فیصدی اکثریت حکومت برطانیہ کے پرانے خیر خواہوں اور کاسہ
لیسوں کی ہے۔ یہ خامی عوام کی تھوڑی سی حرکت اور ان کے معمولی سے جمہوری جہاد سے
دور کی جا سکتی ہے۔ مسلم لیگ کا بنیادی اصول مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کرنا ہے۔
ہمیں اس کو صرف اسی باٹ سے تولنا ہے۔ یہ بنیادی اصول استعماری پالیسی سے پیدا ہوتا
ہے یعنی تعلیم اور سیاسی اداروں میں مرتب فرقہ پروری اور اس کے ساتھ ساتھ محدود
سیاسی مراعات، جس کی وجہ سے ایک چھوٹی سی شہری جماعت کا ابھرنا ضروری ہے
مسلم لیگ کے بنیادی اصول سے مجھے سب سے بڑا اختلاف یہ ہے کہ بہت سے قومی
سیاسی، معاشی اور تمدنی مسائل ایسے ہیں جو صرف ایک قومی جماعت ہی کے پلیٹ
فارم سے حل کئے جا سکتے ہیں۔ فرقہ وارانہ جماعتیں ان کے متعلق سوائے غلط مبحث پیدا
کر دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتیں۔ اس کے علاوہ فرقہ وارانہ جماعتیں قومی کیرکٹر کو کمزور
بودا اور بزدل بناتی ہیں۔ اور بھولے بھالے عوام میں تنگ نظری تعصب اور کوتاہ اندیشی
کی خطرناک بیماریاں پیدا کرتی ہیں۔ اس قسم کی جماعتیں اپنی فطرت کے مطابق بدترین
قسم کے رجعت پسندوں ٹوڈیوں اور فرقہ پرستوں کو اپنا سپہ سالار بنانے پر مجبور ہیں
کیونکہ ان جماعتوں میں لازمی طور سے وہی اشخاص رہنمائی کے قابل سمجھے جاتے ہیں
جو سب سے زیادہ بلند آواز سے چیخ چیخ کر یہ کہہ سکیں کہ "مذہب خطرہ میں ہے"۔ یہ
اشخاص فرقہ وارانہ جماعتوں کی آڑ لیکر ہر ترقی پسند تحریک کی راہ میں روڑا اٹکاتے
ہیں اور بنیادی طور سے ترقی معکوس کے خواہاں اور انقلاب دشمن ہوتے ہیں یہ ہر اس
چیز کو مذہب سے ٹکرا دیتے ہیں جس کو خود ناپسند کرتے ہیں۔ اور اس طریقہ سے درحقیقت یہ مذہب

کے سب سے بڑے دشمن ملکہ بیخ کن ثابت ہوتے ہیں۔

اب اگر کانگرس سے مسلمانوں کو کوئی شکایت نہ ہوتی تو یہ بحث یہیں ختم ہو جاتی اور مسلمان مسلم لیگ کو لعنت ملامت کرکے کانگرس میں شامل ہو جاتے لیکن کانگرس اپنی چند کمزوریوں کے باعث اس بحث کو یہیں ختم نہیں ہونے دیتی۔ مسلمانوں کی اکثریت کانگرس سے خوش نہیں۔ میں اس وقت اس الجھاوے میں نہیں پڑنا چاہتا کہ مسلمانوں کو کانگرس سے جو شکایتیں ہیں وہ کس حد تک جائز اور بجا ہیں اور کس حد تک محض محض بدگمانی اور بدظنی کا نتیجہ ہیں۔ موجودہ بحث کو اس کے حدود میں رکھنے کے لئے مجھے اس امر واقعہ کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی عار نہیں کہ مسلمانوں کو کانگرس سے شکایتیں ہیں۔ خواہ اُن کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ یہ شکایتیں کچھ اس قسم کی ہیں (۱) زبان کے متعلق (۲) گائے کشی کے متعلق (۳) ملک کے آئندہ تمدن اور معاشرت کے متعلق۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ شکایتیں کیوں پیدا ہوئیں اور کیسے دور کی جا سکتی ہیں؟ میں اُن کے خاص اسباب حسب ذیل سمجھتا ہوں۔

خلافت کی تحریک کے بعد مسلمان من حیث الجماعت کانگرس کی تحریک سے علیحدہ ہو گئے۔ اس تحریک کے بعد کانگرس نے جتنے معرکے سر کئے اُن کو ہندو صرف اپنی قوت بازو کا نتیجہ جانتے ہیں اور اس وجہ سے "وزارت کی لوٹ" کا بھی صرف اپنے ہی کو حقدار سمجھتے ہیں۔ ملک میں کسانوں، مزدوروں اور نیچے طبقہ کی ابھی تک کوئی منظم اور مستحکم تحریک شروع نہیں ہوئی جس کی وجہ سے کانگرس پر سرمایہ دار، زمیندار، تجارت پیشہ اور آزاد پیشہ لوگ چھائے ہوئے ہیں اور اس میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جن کے دماغوں میں آزادی اور متحدہ قومیت کا کوئی تخیل نہیں سا تھ ہی

ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ کانگرس سے مسلمان کی بہت سی شکایتیں محض بدگمانی اور بدظنی پر مبنی ہیں اور صرف فرقہ پرست لیڈروں کی افتراپردازی کا نتیجہ ہیں جو ان کے سرمایہ سے اپنی قیادت کے کاروبار کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

یقیناً ان اسباب کو اس سے صورت سے ہرگز دور نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمان ایک فرقہ دارانہ جماعت میں شامل ہو جائیں۔ ان اسباب کو دور کرنے کا واحد ذریعہ قومی تحریکات میں پیش پیش رہنا ہے ہندوؤں کی فرقہ پرستی سے مرعوب ہو کر قومی تحریکات سے بھاگنا نہ صرف بزدلی بلکہ خودکشی کے مترادف ہے اگر مسلمانوں نے واقعی ایسا کیا تو وہ خود اپنی حالت وہی بنا لیں گے جو آج جرمنی میں یہودیوں کی ہے یا امریکہ میں حبشیوں کی۔ جتنا زیادہ مسلمان کانگرس سے دور ہوتے جائیں گے اتنا ہی زیادہ فرقہ پرست، متعصب اور رجعت پسند ہندوؤں کا اقتدار کانگرس میں بڑھتا جائے گا۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ مردانہ وار کانگرس میں شامل ہوں اور اس میں رہتے ہوئے نہ صرف منظم طور سے اپنے جائز حقوق اور مطالبات کے لئے جد و جہد کرتے رہیں بلکہ اپنا پورا وزن اس کے غیر متعصب اور ترقی پسند عنصر کی طرف ڈال دیں تاکہ اس کی موجودہ غیر مانوس فضا ختم ہو جائے۔ جہاں ہم کانگرس کی کمزوریاں نہیں بھول سکتے وہاں ہم کو یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ وہی ایک ایسی جماعت ہے جو برطانوی آمریت کے مقابلہ میں ملک کی آزادی کی خاطر ہندوستانیوں کا ایک متحدہ محاذ پیش کر سکتی ہے اور صرف اسی پلیٹ فارم سے ہم بلا تفریق مذہب و ملت طبقہ وارانہ تنظیم کر سکتے ہیں اور اپنے تیس کروڑ مظلوم بھائی بہنوں کی مصیبتیں اور پریشانیاں ختم

کر کے آزادی خوشحالی اور امن کا نظام قائم کر سکتے ہیں ہم اپنے رفیقان سفر سے انکی لغزشوں اور خامیوں پر خفا ہو سکتے ہیں ان کو جھڑک سکتے ہیں لیکن ہم ہرگز یہ نہیں کر سکتے کہ ان کی بدعنوانیوں کی وجہ سے سرے سے اپنا سفر ہی ملتوی کر دیں۔ اور منزل کی طرف سے پیٹھ موڑ کر صرف ان کی شکایتوں کا دکھڑا ہی روتے رہجائیں۔ ساتھ ہی ساتھ میں ایک بات یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمان فرقہ وارانہ جماعتوں کی آڑ میں اپنی حرکت اور زندگی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں تو وہ اپنا زور اور قوت بے نتیجہ صرف کریں گے ایک فرقہ وارانہ جماعت ہمیشہ در پردہ دوسری فرقہ وارانہ جماعت کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنا فرقہ وارانہ تمدن اور معاشرت اس کے سر تھوپے اگر آج کانگرس نے مسلم لیگ کے معقول اور نامعقول سب مطالبات تسلیم بھی کر لئے تب بھی اس سے مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ کیا جس روز کانگرس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مان لیگی اس وقت فوراً اردو ہندی کا قضیہ ختم ہو جائے گا؟ اس کے بعد سے گاؤکشی کا کوئی قضیہ اٹھیگا؟ ہندوؤں کے تعصب کی کوئی شکایت سنائی نہ دیگی؟

یہ شکایتیں اگر کبھی بھی دور ہو سکتی ہیں تو صرف باہمی نیک نیتی اور اعتماد سے اور حقیقتاً آج وہ قوم پرست مسلمان جو ایک طرف تو اپنے بھائیوں کی لعن طعن کا شکار ہیں اور دوسری طرف برادران وطن سے اپنے حقوق اور مطالبات کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اس باہمی نیک نیتی اور اعتماد کی فضا پیدا کرنے کے لئے بڑی قربانیاں کر رہے ہیں اور قابل مبارکباد ہیں۔

کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت کا سوال ایک بہت پیچیدہ گتھی بن گیا ہے۔

مسلمان زیادہ تعداد میں کانگریس میں اس وجہ سے شامل نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہاں ابھی تک فرقہ پرست ہندوؤں کا اقتدار ہے اور کانگریس میں فرقہ پرست ہندوں کا اقتدار اس وجہ سے ہے کیونکہ مسلمان زیادہ تعداد میں اس میں شامل نہیں ہوتے۔ اب یہ گتھی سلجھائی کس طرح سے جائے؟ مسلمانوں کا باہمت اور جواں مرد ترقی یافتہ اور انقلاب پرور طبقہ آگے بڑھے۔ اور اپنے اور غیروں کی شدید مخالفت اور مزاحمت کے باوجود اس پرخار راستہ کو صاف کرے۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ راستہ صاف نہیں ہو سکتا کیونکہ چاہے جتنے مسلمان کانگرس میں شامل ہو جائیں تب بھی ہندوؤں کے مقابلہ میں وہ اقلیت ہی میں رہیں گے۔ میں اس اعتراض کو اپنے حق میں مفید سمجھتا ہوں۔ اگر مسلمان کانگرس کے اندر منظم رہتے ہوئے اکثریت رکھنے والی جماعت سے اپنے مفید مطلب کوئی بات نہیں کرا سکتے تو وہ باہر رہکر کیا کرا سکتے ہیں؟ یہ اعتراض غلط ہے۔ کانگرس میں رہتے ہوئے اور برادران وطن کے کندھے سے کندھا ملا کر جنگ آزادی میں لڑتے ہوئے مسلمان اپنے ہاتھوں کو بہت زیادہ مضبوط اور اپنی آواز کو حد سے زیادہ وقیع بنا لیں گے۔

آج ہر طرف مسلمانوں کے تمدن اور معاشرت کی بربادی کا شور اور ہنگامہ ہے لیکن کیا ہم نے کبھی غور بھی کیا ہے کہ اس تمدن اور معاشرت کے اصلی دشمن کون ہیں؟ کیا دنیا کی کوئی طاقت مسلمانوں کے تمدن اور معاشرت کو اس ہولناک طریقہ سے مٹا سکتی ہے جس طرح آج ان کی غریبی اور جہالت ان کو مٹا رہی ہیں بلا معاشی اور سیاسی آزادی کے مسلمان ہرگز ہرگز اپنے تمدن اور معاشرت کی حفاظت نہیں کر سکتے لیکن کیا یہ معاشی اور سیاسی آزادی فرقہ وارانہ جماعتوں کے

ذریعہ نصیب ہو سکتی ہے ؟ کیا اگر آج اسمبلیوں میں مسلمانوں کے حسب منشا انکی نشستیں مخصوص کر دی گئیں۔ اور اُردو زبان کی زندگی کا انکو اطمینان دلادیا گیا تو مسلمان کاشتکاروں اور مسلمان مزدوروں کے مسائل حل ہو جائیں گے اور پھر چند شہری مسلمانوں کے تمدن اور معاشرت کے تحفظ سے ہندوستان کے عام مسلمانوں کا تمدن اور معاشرت خطرہ کی زد سے باہر ہو جائیگا۔

فرقہ وارانہ تنظیم میں مسلمانوں کی کوئی فلاح نہیں ہو سکتی انکی زندگی کا راز دوسری قوموں کی زندگی کے راز کی طرح طبقہ وارانہ تنظیم میں ہے۔ انھیں کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم میں پیش پیش رہنا چاہئے۔ اور یہی تنظیم انہیں زندہ رہنے کی تمنا اور ان میں آزاد ہونے کی تڑپ پیدا کر سکتی ہے جس کے بعد چوبیس کروڑ ہندو کیا چوبیس اب ہندو بھی ان کو خائف نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں نے اگر فرقہ وارانہ تنظیم کی تو واقعی ان کو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اکثریت رکھنے والی جماعت اپنی فرقہ وارانہ تنظیم سے ایک روز ان پر حکمران ہو جائے۔ لیکن اگر انھوں نے طبقہ وارانہ تنظیم کی اور کاشتکاروں اور مزدوروں کی جمہوری حکومت کے لئے جان لڑا دی تو ایسی حکومت میں ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا آج ہر خوددار اور حریت پرور مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس طبقہ وارانہ تنظیم کو لیکر آگے بڑھے اور کاشتکاروں اور مزدوروں اور بے روزگاروں اور دوسرے مظلوم طبقوں کی تحریک کو قوت پہنچائے۔

وجاہت علی سندیلوی۔ بی۔ اے

چین کے مشہور رہنما ڈاکٹر سن یات سین نے چینیوں کے سیاسی نصب العین کو مختصر طور پر تین لفظوں میں بیان کیا تھا۔ قومیت، جمہوریت اور روزی۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی نصب العین کو بھی اسی طرح تین لفظوں میں مختصر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے یعنی اسلام، آزادی اور خوشحالی۔ میں اپنے مفہوم کو سمجھانے کے لئے ان تینوں اصطلاحوں پر الگ الگ کچھ باتیں بیان کروں گا

اسلام

اسلام کو میں نے قصداً سب سے اول رکھا ہے کیونکہ اسکو ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے ہندوستان میں ابھی تک آبادی کے ایک بہت کثیر حصہ کی زندگی پر مذہب کا پورا تسلط قائم ہے اس میں شک نہیں مذہب کا اعلیٰ تصور لوگوں کے ذہنوں میں موجود نہیں ہے۔ توہم پرستی اور تعصب نے مذہب کو ایک تعمیری اور اصلاحی قوت کی جگہ ایک تخریبی اور قدامت پسند قوت بنا دیا ہے۔ مذہب ترقی کی قوتوں کا ہراول بننے کی جگہ رجعت اور انتفاع ناجائز کی قوتوں کا آلہ کار بن گیا ہے۔ مذہب کے اعلیٰ جذبہ سے صحیح کام لینے کی جگہ غلط کام لیا جا رہا ہے مارکس کے الفاظ میں مذہب کو ایک نشہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ جس سے قوائے عمل یا تو مضمحل اور بیکار ہو جاتے ہیں۔ یا کجروی اور گمراہی

کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات، مذہب کے نام پر انسانی جانوں کی قربانی اور آئے دن کی شر انگیزی اور فتنہ پروری۔ یہ سب مذہبی گمراہی کے نتائج ہیں۔ جب میں مذہبی زندگی کی حمایت کرتا ہوں تو میرے پیش نظر مذہب کا یہ تصور ہرگز نہیں ہوتا۔ اس مذہب کی مخالفت میں تو میں کارل مارکس سے بھی دو قدم آگے جانے کے لئے تیار ہوں۔ مذہب کی کورانہ تقلید، مذہب کی روح کو چھوڑ کر اس کے الفاظ پر اصرار، اور لفظی اختلافات پر فرقہ بندی اور ہنگامہ خیزی اور قوم کی قوتوں کے بیکار اور مہمل مقاصد کے حصول کے لئے وقف کر کے ضائع کرنا ان چیزوں کو میں مذہبی خدمت نہیں بلکہ مذہب کے ساتھ دشمنی سمجھتا ہوں۔

لیکن مذہب کا ایک دوسرا تصور بھی ہے جو ہر چند فی الحال مفقود اور معدوم ہے لیکن جسے ایک زندہ اور فعال قوت بنایا جا سکتا ہے۔ مذہب کا یہ تصور وہ ہے جو فتنہ کی جگہ امن پیدا کرتا ہے۔ زخموں پر مرہم رکھتا ہے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتا ہے۔ محبت اور ایثار کے اعلیٰ ترین معیاروں کو قائم کرتا ہے جس سے نوع انسان کی یک جہتی، اتحاد اور باہمی انحصار کا احساس تیز ہوتا ہے جو موجودہ محدود اور نامکمل زندگی کے مقابلہ میں ایک زیادہ مکمل اور وسیع تر زندگی کی اُمید قائم کراتا ہے جو انسانی قوتوں کے پوشیدہ امکانات کی ترقی کے بارے میں ایسا راسخ عقیدہ رکھنے کی طرف مائل کرتا ہے جو فانی، گمراہ، جاہل اور مجبور انسان کو ایک ازلی اور ابدی علیم و بصیر مختار و مقتدر قوت سے وابستہ کر کے اس کے حوصلوں کو بلند، اس کے عزائم کو پختہ اور اس کی کوششوں کو وسیع بنا دیتا ہے۔ مذہب کی یہ اور اسی طرح کی اور بہت سی دوسری خدمات ہیں۔ جن کی وجہ سے میں مذہبی زندگی کی

حمایت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ مذہبی زندگی کو جو بنیادی اہمیت ابھی تک حاصل رہی ہے وہ آئندہ بھی اُسے حاصل رہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مذہب کا مفہوم وہ نہ لیا جائے جس کا اس وقت غلبہ ہے اور جو ہماری پستی اور بدنصیبی کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔

مذہب کی اہمیت پر ایک عام تبصرہ کرنے کے بعد میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ ہندستان کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں اسلام کو کیوں بنیادی اہمیت حاصل رہنا چاہئے۔ اسلام مسلمانوں کی کشتی کا بادبان۔ ان کے جہاز کا انجن اور ان کے تمام اجتماعی اعمال و افعال کا محرک ہے۔ اسلام کی تعلیمات مسلمانوں کو پست خود غرضیوں۔ ذاتی فائدوں اور انفرادی لالچوں سے بلند کر کے اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لئے قربانیاں سکھاتی ہیں۔ اسلام کی تاریخ ان کے اندر اعتماد اور حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ دنیا میں اخلاقیات اور فلسفہ کے بہت سے نظام پیش کئے گئے ہیں لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اور فلسفہ نے جیسی قوت عمل اپنے ابتدائی پیرؤوں میں پیدا کی تھی اس کی مثال دنیا میں بہت کم ملتی ہے۔ پھر تاریخ اور روایات کی وابستگیاں، زبان، ادب اور تمدن، معاشرت کے رشتے اتنے قریبی اور شدید ہوتے ہیں کہ ایک جماعت کو ان سے جدا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہر جماعت کی چند خصوصیات ہوتی ہیں جو اُسے دوسری جماعتوں سے ممتاز کرتی ہیں اور جو اس کی زندگی کے لئے بنیاد کا کام انجام دیتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی بنیاد اُن کا مذہب ہے۔ اسلام کے بغیر ہندوستان کے مسلمانوں کا تصور قائم کرنا مشکل ہے۔ اسلام ان کی زبان، اُن کے ادب، ان کی سیرت، انکی اجتماعی اور تمدنی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور اس کا اس طرح حاوی ہونا ہندوستانی

قومیت کے لئے مضر نہیں بلکہ بہت زیادہ مفید بنایا جا سکتا ہے۔ اسلام نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ذاتی فائدوں اور انفرادی زندگی کے تحفظ کے مقابلہ میں نصب العین کے لئے جان ومال کی قربانی کرنا خوب اچھی طرح سکھلا دیا ہے۔ اسلام کی حفاظت اور عزت کے لئے جاہل اور غریب مسلمان بھی اپنی جان تک کی بازی لگانے میں تامل نہیں کرتے۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کی یہ قربانیاں اسلام کی لفظی حفاظت کے لئے صرف کی جاتی ہیں۔ اسلام کی روح کی حفاظت کے کام سے وہ بیچارے ناواقف ہیں لیکن اگر اسلام کی روح کی حفاظت کے لئے ان کی سرفروشی کو استعمال کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ یہ جاہل اور غریب مسلمان جن پر آج مذہبی دیوانگی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ کل ہندوستان کی ترقی پسند قوتوں کے لئے ایک نہایت جان نثار فوج بن سکتے ہیں۔ ضرورت اسلام کے صحیح تخیل کو عوام تک پہنچانے کی ہے جب یہ تصور مسلمانوں میں عام طور پر پھیل جائے گا تو ان کی وہ پوشیدہ قوتیں جو اس وقت سوئی ہیں یا غلط راہوں پر پڑ کر انتشار اور افتراق کا موجب بنی ہوئی ہیں بیدار اور مجتمع ہو کر وہ زبردست کام انجام دیں گی جن کی مثال دنیا نے آج تک کبھی نہیں دیکھی ہے۔

جو لوگ اسلام کی جگہ اور دوسرے محرکات کو مثلاً قومیت کے جذبہ یا روٹی کے سوال کو بیدار کر کے مسلمانوں سے کام لینا چاہتے ہیں اُن کو میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ ایک طاقتور انجن کی جگہ ایک کمزور انجن سے مشین کو چلانا چاہتے ہیں۔ وہ کم ہمت ہیں زیادہ طاقتور انجن کو چلانے سے ڈرتے ہیں، اس لئے ایک کمزور انجن سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ طاقتور انجن موجود ہے اور

ان کی کوششوں سے آسانی کے ساتھ توڑا نہیں جاسکتا اس لئے اگر اس انجن سے وہ کام نہ لیں گے تو یہ انجن ترقی کی دشمن قوتوں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا اور وہ اسے ان کے خلاف استعمال کر کے ان کی قوت کو کمزور کرتے رہیں گے۔

وہ لوگ اس کا جواب شاید دیں کہ ایک ہی سمت میں چلنے والا ایک کمزور انجن مخالف سمتوں میں چلنے والے کئی طاقتور انجنوں سے زیادہ بہتر ہے کیونکہ کمزور انجن تو بہرحال آگے کی طرف ہی بڑھے گا لیکن مخالف سمتوں میں چلنے والے کئی طاقتور انجن ایک دوسرے کی قوت کو کمزور کرتے رہیں گے اور ترقی یا تو بالکل نہیں ہوگی یا بہت آہستہ آہستہ ہوگی یا اگر ایک وقت میں باہمی اتحاد کی وجہ سے ترقی زیادہ ہو جائے گی تو دوسرے وقت میں باہمی نفاق کی وجہ سے دوبارہ بہت پیچھے ہٹنا پڑیگا یہ اعتراض صحیح ہو سکتا ہے اگر مذہب کا موجودہ تنگ نظری پر مبنی تصور قائم رہے لیکن اگر اس کی جگہ مذہب کے ایک زیادہ بلند اور وسیع تصور کے پھیلانے کی کوشش کی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اعتراض باقی نہیں رہے گا اور اس صورت میں ہم ہندوستان کی آبادی کے اندرونی رجحانات اور بنیادی میلانات کو پوری طرح تکمیل کا موقع دیتے ہوئے اجتماعی ترقی کے مقاصد کے لئے استعمال کر سکینگے

پھر قومیت کے جذبہ یا روٹی کے سوال کو دو طریقہ پر محرک بنایا جاسکتا ہے یا انکو ایک زائد محرک کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مجھے دوسری صورت پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ حقیقتاً میں نے اپنا یہ مضمون جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے اسی مقصد کی حمایت میں لکھنا شروع کیا ہے میں اسلام، آزادی اور خوشحالی تینوں محرکات سے فائدہ اٹھانا اور ان تینوں نصب العینوں کو حاصل کرنا چاہتا ہوں

لیکن اگر قومیت کے جذبہ یا روٹی کے سوال کو مذہب کا بدل یا حریف بنا کر پیش کیا گیا۔ تو مشین کے چلنے میں وہی وقت پیدا ہو جائے گی جس کا ذکر ابھی اوپر کیا جا چکا ہے یعنی کئی طاقتور انجن مشین کو مختلف سمتوں میں کھینچنا شروع کر دیں گے اور مشین آگے نہیں بڑھ سکے گی۔

مندرجۂ بالا تمام امور کے پیش نظر میرا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست میں اسلام کو ضرور بنیادی حیثیت حاصل ہونا چاہیئے اور ایسی تمام کوششیں جو متحدہ قومیت کا نام لیکر یا معاشی سوال کو نمایاں کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو اسلام سے ہٹاتی ہیں بالآخر خود ہندوستان کی ترقی کے لئے سخت مہلک ثابت ہو سکتی ہیں۔ مسلمانوں کو اس قسم کی کوششوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں جن تحفظات کی وہ ضرورت محسوس کریں ان کے حصول کے لئے اپنی پوری جد وجہد کو جاری رکھنا چاہیئے اس نصب العین کے حصول کے لئے انھیں کس قسم کی کوششیں کرنا چاہیئے۔ آیا مسلم لیگ کی طرح ایک ادارہ قائم رکھنا چاہیئے جو سیاسی اور معاشی مقاصد میں تو کانگریس سے پوری طرح ہم آہنگ ہے لیکن اس کے باوجود اپنے آزاد اور جداگانہ جماعتی وجود کو تسلیم کرانے پر مصر ہے یا مسلمانوں کو انفرادی طور پر کانگریس میں شامل ہو جانا چاہیئے اور جب کبھی اسلامی معاملات پیش ہوں کانگریس کے اندر ایک متحدہ محاذ بنا لینا چاہیئے اور ایسی ضمانتوں کو کانگریس سے تسلیم کرانا چاہیئے جن سے اسلامی معاملات میں یہ لوگ اپنی اقلیت کی وجہ سے بالکل مجبور اور بے بس ہوں۔ ان سوالات کے جواب میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے میں یہاں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن مسلمانوں کے لئے تحفظات کا جہاں تک سوال ہے موجودہ حالات میں میں انکی ضرور

تائید کرتا ہوں۔

آزادی اسلام کے بعد دوسری چیز جسے مسلمانوں کو اپنے سیاسی نصب العین میں داخل کرنا چاہیے وہ آزادی ہے۔ میں نے آزادی کو اسلام کے بعد اس لئے رکھا ہے کہ میرے نزدیک اسلام ایک عمل ہے جس کا ایک جزو سیاسی آزادی بھی ہے اسلام تمام اعلیٰ محرکات کا سرچشمہ ہے جس کی ایک شاخ آزادی بھی ہے۔ آزادی میں میں دونوں چیزوں کو شامل کرتا ہوں۔ غیر ملکی تسلط اور انتقاع ناجائز سے آزادی نیز جمہوری طرز حکومت۔

غیر ملکی تسلط ہندوستانیوں کے قومی وقار اور عزت نفس کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ کسی قوم کو دوسری قوم کا غلام رہ کر زندگی بسر نہیں کرنا چاہیئے۔ ہندوستانی قوم کی محکومیت انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے ہم اسے ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ ہمارے اخلاقی احساس اور روحانی جذبہ کا ایک ایک مظہر اس کے خلاف بغاوت کے لئے آمادہ ہے۔ خود مختاری ہمارا حق ہے۔ ہم غیر ملکی حکمرانوں کی اطاعت نہیں کر سکتے۔ اگر غیر ملکی حکمران نہایت اچھے اور ان کی حکومت ہمارے لئے بہت فائدہ رساں بھی ہوتی۔ تب بھی ان مادی فائدوں کے معاوضہ میں ہم اپنی آزادی کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پھر جب غیر ملکی حکومت ہم سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے اس کی پچھلی تاریخ مہذب لوٹ کھسوٹ کی ایک مسلسل داستان ہے۔ ہماری صنعتوں کی تباہی، ہمارے محاصل کی زیادتی، ہماری عدیم المثال غریبی، ہماری جہالت۔ ہمارے دیہاتوں کی ویرانی، ہمارے شہروں کی بے رونقی، حکومت کی جانب سے ہمارے آرام و آسایش کی طرف سے لاپروائی۔ ہمارے عوام کی بے بسی اور ہمارے

تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کی گمراہی اور بے روزگاری اور ان تمام حالات کی موجودگی میں غیر ملکی حکومت کی سخت دلی اور ہماری آزادی کی تحریکوں کو دبانے اور کچلنے کی کوشش یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے الزامات سے غیر ملکی حکومت کا اعمال نامہ بالکل سیاہ ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں ہم غیر حکومت سے کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔

لیکن ہماری آزادی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم سفید دفتری حکومت کی جگہ ایک بھورے رنگ کی دفتری حکومت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ ہمارا مقصد جمہور کی آزادی ہے۔ سیاسی زندگی میں کوئی ایک شخص دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ اقتدار کا مالک نہیں ہو سکتا۔ قانون کی نگاہ میں سب مساوی ہونے چاہئیں قانون کے بنانے میں سب کو شرکت کرنی چاہیے ایک کا بنایا ہوا قانون اگر دوسرے پر اس کی مرضی کے خلاف عاید کیا گیا تو اس کی آزادی ختم ہو جائے گی۔ اس میں شک نہیں۔ جماعتی زندگی میں انفرادی آزادیاں ایک نسبتی اور اضافی مفہوم رکھتی ہیں یعنی ایک مفاہمت اور مصالحت کا نتیجہ ہوتی ہیں جس میں افراد کی متفرق اور مخالف آزادیوں میں ایک ہم آہنگی اور تناسب پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے افراد کے انفرادی نفس اور جماعتی نفس، وقتی مفاد اور مستقل اور دیرپا مفاد میں توازن پیدا کیا جاتا ہے اور اسی توازن کی تنظیم کا نام ریاست یا مملکت ہوتا ہے۔

آج کل کے زمانہ میں جبکہ کئی طرز کی حکومتوں نے جمہوریت کو ایک حسین فریب کے نام سے موسوم کرنا شروع کر دیا ہے اور ان ملکوں میں جہاں اس کا تجربہ کئی صدیوں سے کیا جا رہا ہے اس کی خرابیاں اور بدعنوانیاں روز بروز ظاہر ہوتی جا رہی ہیں، جمہوریت کے نظام کو پسندیدہ قرار دینے کے لئے بھی دلیلیں پیش کرنے کی ضرورت

محسوس کی جانے لگی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے بلاشبہ ان تمام خوش آیند امیدوں کو جو انقلاب فرانس کے بانیوں نے اس کے ساتھ وابستہ کی تھیں پاش پاش کردیا ہے۔ سرمایہ کی طاقت ہمارے زمانہ میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ہماری تمام قانونی آزادیوں کو اپنے مسموم اثرات سے برباد کرسکتا ہے سرمایہ کا گھن اندر ہی اندر ہماری آزادیوں کو کھاتا رہتا ہے۔ جمہوریت کا ظاہری فریب قائم رہتا ہے اور پردہ کے پیچھے سے سرمایہ دار جس طرح چاہتے ہیں سیاسی کٹ پتلیوں کو نچاتے رہتے ہیں۔ تعلیم اور پروپیگنڈا کی مشین پر پوری طرح ان کا قبضہ ہوتا ہے۔ اپنی ہشیاری اور چالاکی سے یہ لوگ سب کام اپنے مطلب کے موافق کراسکتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو تنظیم دیتے ہیں۔ انتخابات پر پورا اقتدار رکھتے ہیں۔ لالچ، دھمکی اور دھونس کے ذریعہ ذلیل اور ادنی درجہ کے وقتی جذبات کو بھڑکا کر اپنے پھوڑوں کو منتخب کرا لیتے ہیں اور اس طرح حکومت کی پوری مشین پر اپنا تسلط قائم کرلیتے ہیں۔ مغربی جمہوریتیں درحقیقت سرمایہ داروں کے اقتدار مطلق کا دوسرا نام ہیں۔ جمہوری نصب العین کی اس گمراہی اور خرابی کو دیکھکر تو بلا شبہہ جمہوریت کی طرف سے ایک تنفر اور حقارت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن کلیت پسند ریاستوں کے کارناموں اور ان کے حکمرانوں کی کارگزاریوں سے بھی طبیعت میں کوئی اطمینان کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اقتدار کو اگر مطلق رکھا جائے تو اس کو غلط طریقہ پر استعمال کرنے کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے کسی انسان کو غلطی اور خطا سے پاک نہیں سمجھا جاسکتا۔ ہر ریاست میں حکمرانوں کو ان کی غلطی سے متنبہ کرنے والے لوگ موجود ہونے چاہئیں اور اپنی پالیسی کی

ناکامی کی صورت میں حکمرانوں کو اقتدار کی جگہوں سے علیحدہ کرنے کے لئے صرف خونی انقلاب کا ہی راستہ کھلا ہوا نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ امن وامان کے ساتھ ایک حکمران کی جگہ دوسرے حکمران کو مقرر کرنے کا امکان ہونا چاہیے۔ موجودہ آمروں کے جانشینوں کا مسئلہ ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے آج جو لوگ یورپ کے ڈکٹیٹر بنے ہوئے ہیں ان کے مرنے کے بعد ان کی جگہ کوئی شخص لے سکیگا یا نہیں۔ اور ان کے زمانہ میں جو ملک کو ترقی ہوئی ہے اسے جاری رکھا جاسکے گا۔ یا نہیں یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی جمہوریت میں اس قسم کی کوئی مشکلات نہیں ہیں۔ اگر سرمایہ کے اقتدار کو کم کیا جاسکے اور تقسیم دولت میں زیادہ مساوات پیدا کی جاسکے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جمہوریت آمریت کے مقابلہ میں کیوں زیادہ کامیاب ثابت نہ ہو خصوصاً ایسی صورت میں جب جمہوریت کو ان نئی تدبیروں کے ساتھ اختیار کیا جائے جن کے ذریعہ سے اقلیت کو اپنی آواز کو موثر بنانے کے لئے کافی مواقع حاصل ہو جاتے ہیں۔

خوشحالی آزادی کے بعد تیسری چیز جسے مسلمانوں کو اپنے سیاسی نصب العین میں داخل کرنا چاہیئے وہ خوشحالی ہے جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا آزادی کو معاشی مساوات سے بہت گہرا تعلق ہے اگر خوشحالی ایک خوش نصیب اقلیت تک محدود نہ ہوگی بلکہ آبادی کی کثیر اکثریت اس میں پورے طور پر شریک ہوگی تو جمہوریت کی وہ خرابیاں جو معاشی شکست اور مجبوری اور تعلیم و تہذیب کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں پیدا نہ ہوسکیں گی۔

ہندوستان میں جس بھیانک قسم کی غریبی اس وقت پائی جاتی ہے اسکو دیکھتے

ہوتے تو غریبی کو دور کرنے کے مقصد کو مسلمانوں کے سیاسی نصب العین میں اول جگہ ملنا چاہئے تھی۔ لیکن سوال انفرادی غریبی کے دور کرنے کا نہیں ہے سوال نفع ذاتی اور خود غرضی کا نہیں ہے۔ سوال ہے کل جماعت کی آیندہ خوشحالی کے لئے اجتماعی کوشش کرنے کا۔ ہندوستان کی موجودہ غریبی کا علاج صرف اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب نہایت بڑے پیمانہ پر ہماری آبادی ایثار اور قربانی کے لئے آمادہ ہو۔ یہ قربانی فوری اور ذاتی نفع کے لئے نہ کی جائے بلکہ مستقبل کے اجتماعی اور دائمی فائدہ کے لئے کی جائے سب سے اول تو ہمیں آزادی کے حصول کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں کرنا پڑیں گی۔ لیکن ہماری قربانیوں کا سلسلہ آزادی کے حصول کے بعد ختم نہیں ہو جائیگا۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ صبر آزما اور حوصلہ فرسا طریقہ پر شروع ہوگا۔ آزادی کے حصول کے بعد اس کا پورا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ ہمارے اندر جاہ و اقتدار کے حصول کے لئے رقابتیں پیدا ہو جائیں۔ ہم اپنی قربانیوں کا فوری معاوضہ طلب کرنے لگیں۔ ہمارا احساس فرض اور ضبط و تنظیم کمزور ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ہندوستان کے لئے بڑی بدنصیبی کا دن ہوگا۔ کیونکہ ہماری تعمیر نو کا کام بہت سخت ہے۔ ہماری جیسی غریبی اور محرومی کی دنیا میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ اس کی کوئی تھاہ اور انتہا نہیں ہے غریبی اور محرومی کے اس گہرے گڑھے کو پاٹ کر اپنی آبادی کو مہذب ملکوں کی خوشحالی کی سطح پر لانا آسان کام نہیں ہے۔ ہمیں پہاڑوں کو توڑنا ہے دریاؤں کو سدھانا ہے۔ جنگلوں میں اپنے مطلب کی چیزیں حاصل کرنے کے لئے ارا ارا پھرنا ہے۔ ہمیں مشینوں کو کھڑا کرنا ہے بجلی کی طاقت کو پیدا کرنا ہے۔ ہمیں کاریگار مزدوروں، صنعتی ماہروں۔ مالی رہنماؤں

اور نقطوں کو پیدا کرنا ہے۔ ہمیں اپنی تندرستی کو بہتر بنانا ہے۔ اپنے تعلیمی نظام میں اصلاح کرنی ہے۔ اپنی سیرت میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنا ہے۔ ہمیں عملی محرکات میں تیزی پیدا کرنا ہے ہمیں کاموں کو ولولے، جوش، امنگ اور ہماہمی کے ساتھ ایک طویل مدت تک جاری رکھنا ہے۔ جب ہم یہ سب کام کریں گے۔ تب ہی اپنی آبادی کو خوشحال بنا سکیں گے۔ کم اجرت پر زیادہ عرصہ تک سخت محنت کے کام ایمانداری اور احساس فرض کے ساتھ کرنے کے لئے ایک نہایت قوی محرک کی ضرورت ہے اور وہ قومی محرک مذہب کا ہی ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے خصوصاً اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ میں حوصلہ اور اُمنگ کا ایک لازوال سرچشمہ موجود ہے۔ اسلام کے غازی اپنے نصب العین کی اشاعت کے سلسلہ میں کوہ و بیابان، اور سمندر پار مارے مارے پھرتے تھے۔ گھربار عزیزا قربا سب سے بے نیاز ہو کر اُن کا ہر قدم آگے کی سمت بڑھتا تھا۔ جان کی انھیں پرواہ نہیں تھی۔ ان کی متاع، ان کا اوڑھنا بچھونا صرف ان کا ایمان ہوتا تھا وہ اسلام اور ایمان کو روشن کرنے اور توحید کی اشاعت کرنے کے لیے زندہ رہتے تھے۔ اپنے نصب العین کے لیے جن کوششوں اور کامیابیوں کا نمونہ مسلمانوں نے پیش کیا ہے تاریخ اس کی مثالیں کم پیش کر سکتی ہے اگر مسلمانوں میں مذہب کا صحیح جذبہ پھر پیدا ہو جائے اور وہ اس بات کو سمجھ سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے موجودہ زمانہ میں ان کے فرائض کیا ہیں انھیں ترقی کی کن راہوں پر سفر کرنا ہے، انھیں کس قسم کے دشمنوں کو زیر کرنا ہے، ان کے جہاد کی منزلِ مقصود

اب کیا ہونا چاہیئے۔ انھیں نئے حالات میں کس قسم کے ہتھیاروں کو استعمال کرنا چاہیئے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ معاشی سیاسی اور تمدنی تعمیر نو کے کام میں مسلمان آج بھی اپنے ایمان کی برکت سے سب قوموں سے آگے رہ سکتے ہیں

غرضکہ یہ وہ وجوہ ہیں۔ جن کی بنا پر میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی نصب العین کو تین لفظوں میں مختصر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہم اسلام کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ کیونکہ ہماری زندگی اسلام کے ساتھ وابستہ ہے البتہ اسلام پر قائم رہتے ہوئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے ملک کو غیروں کی محکومی سے آزاد کرا کے ملک میں جمہوری طرز کی حکومت قائم کریں اور ملک کے افلاس اور غریبی کے مسئلہ کو حل کرنے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ کوشش کریں۔

پروفیسر محمد عاقل۔ ایم۔ اے

مسلمان کیا کریں ؟ بظاہر وقت کا یہ ایک اہم سوال ہے لیکن عملی طور پہ انیسویں صدی کے وسط ہی سے مسلمانوں کے سامنے یہ اہم اور پیچیدہ سوال رہا ہے۔ اور انھوں نے اس سوال کو حل کرنے کے لئے متعدد اقدامات بھی کئے ہیں۔ لیکن اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان مفکرین نے نظری حیثیت سے اس مشکل مسئلہ پر اتنا غور نہیں کیا ہے جتنا عمل و کردار سے اس کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اس وقت تک باوجودیکہ مسلمانوں کی تاریخ میں عمل و کردار اور ایثار و قربانی کے جلی نقوش نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ پر اسی طرح قائم ہے اور آج تک ہم کوئی قطعی اور آخری فیصلہ نہیں کر سکے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میرے خیال میں اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں جب کبھی عمل و قربانی کا سوال پیدا ہوا۔ مسلمانوں نے بے پناہ عمل کیا اور بیدریغ قربانیاں دیں لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی یہ کبھی نہیں سوچا کہ وہ سوال ملکی ہے یا غیر ملکی محرکات دیسی ہیں یا بدیسی۔ ان کی قربانیاں اپنے لئے ہیں یا غیروں کے لئے۔ عمل و ایثار کی فراوانی اور فکر و فہم کی کم مائیگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان کبھی بلقان کے نام پر مضطرب

ہوا۔ کبھی خلافت کی بقاء کے لئے لڑا۔ کبھی فلسطین کے واسطے سینہ سپر ہوا۔ اور کبھی مسجد شہید گنج اور مدح صحابہ کے لئے آمادۂ پیکار ہوا۔ لیکن یہ سوال کہ "مسلمان کیا کریں" آجتک حل نہ ہوا اور اس کی اہمیت روز بروز بڑھتی گئی۔

میرے خیال میں اس سوال پر غور کرنے سے قبل ہمیں چند اور بنیادی سوالات پر غور کرنا ضروری ہے۔ اور تاوقتیکہ ان کو نظری حیثیت سے صاف نہیں کیا جائیگا یہ سوال حل نہ ہوگا "مسلمان کیا کریں" ہمیں کسی طریق کار پر غور کرنے اور اسے متعین کرنے کی دعوت دیتا ہے لیکن محض طریق کار تو ہمارا مقصود بالذات نہیں ہو سکتا۔ مقصود ہمارا دوسرا ہے اور طریق کار دوسرا۔ اسی طرح ہماری مشکلات دوسری ہیں اور خطرات دوسرے۔ لہٰذا اس موضوع پر بحث کرنے سے قبل ہمیں اس سوال پر غور و خوض کرنا پڑیگا کہ مسلمانوں کی موجودہ مشکلات اور آنے والے خطرات کیا ہیں اور وہ کس وقت اور کس طرح رفع ہو سکتے ہیں؟ اب بحث کا رخ یہ ہوگا۔ (۱) مسلمانوں کی مشکلات و خطرات (۲) اُن کا حل (۳) اور حل کا طریق کار۔

مسلمانوں کی مشکلات

سطحی نگاہ سے دیکھنے والے کے لئے یہ سوال کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں لیکن در حقیقت یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے سیاست دانوں کے فکر و تدبر کو لغزش ہوتی ہے اور وہ ظواہر پر نظر کرتے ہوئے غلط نتائج پیدا کرتے ہیں اور اسی لئے انکی راہیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ مسلمانوں کی مشکلات کا تعین آسان کام نہیں۔ باوجودیکہ

مذہب وملت کے مضبوط روابط تمام مسلمانوں کو ایک اسلامی رشتہ سے مربوط کرتے ہیں اور اسی وجہ سے سطحی مفکرین کو ان کی مشکلات بھی یکرنگ اور مربوط نظر آتی ہیں۔ لیکن معاشی۔ معاشرتی اور اقتصادی اعتبارات سے تمام مسلمان ہمرنگ نہیں ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مسلمانوں کی ملت اور ان کا مذہب بلاشبہ ایک اور صرف ایک ہے۔ لیکن ان کے وسائل معاش۔ طریق بود و باش اور نظام معیشت ایک دوسرے سے سراسر مختلف۔ بلکہ بعض اوقات متضاد اور متصادم ہیں۔ مثلاً مسلمان کاشتکار اور مسلمان زمیندار کی ملت بلاشبہ ایک ہے لیکن ان کے وسائل معاشی ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں ہیں۔ بلکہ متصادم ہیں اور یہ تصادم اس حد تک ہے کہ زمیندار کی خوشحالی کاشتکار کی بدحالی کا نتیجہ ہے اور کاشتکار کی فارغ البالی زمیندار کی تنگ دستی کا سبب۔ یہی حال مسلمان مزدور و سرمایہ دار، اور دستکار و کارخانہ دار کا ہے۔ مذہب و ملت سب کی ایک ہے لیکن معیشت و معاشرت اور اقتصاد و مفاد سب کا مختلف۔ مسلمانوں میں یہ مختلف طبقات ہیں اور ہر طبقہ مذہبی اتحاد اور ملی یکرنگی کے باوجود معیشی اور معاشرتی حالات میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ لہذا یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں میں مختلف طبقات ہیں اور مختلف مفادات اور ان کی حفاظت کے مختلف طریقے، نظام حیدر آباد کے مفاد کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کا شخصی استعمار قائم رہے اور وہ زیادہ سے زیادہ استحصال کریں اور ریاستی باشندوں کا مفاد یہ ہے کہ انھیں ذمہ دار خود مختاری حکومت حاصل ہو اور وہ اپنی مرضی اور اپنے مفاد کے مطابق ریاست کا نظم و نسق کریں۔

اسی طرح زمیندار کا مفاد یہ ہے کہ اراضی پر اس کو تصرف تام حاصل ہو وہ جس قدر چاہے لگان لے اور جب چاہے کسان کو بیدخل کر دے۔ لیکن کاشتکار کا مفاد یہ ہے کہ زمین پر اُس کا تسلط ہو۔ باغ اور مکان لگانے کا حق ہو اور اسے موروثی حقوق حاصل ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ دو متضاد مفاد اور متضاد تقاضے ہیں جو کسی وقت بھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور ہر وقت ایک دوسرے سے متصادم رہتے ہیں۔ لیکن اس تصادم کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ سامراجی نظام حکومت میں سینکڑوں کے مفاد کو کروڑوں کے مفاد پر فتح حاصل ہوتی ہے اور مٹھی بھر زمینداروں۔ ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کی خاطر ۳۲ کروڑ ہندوستانی غریب مزدوروں اور کسانوں کو بھوکا۔ ننگا اور بے گھر رکھا جاتا ہے

اس مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح مسلمان سوسائٹی مختلف طبقات اور مفادات سے بنتی ہے۔ اسی طرح ہر طبقہ کی مشکلات بھی مختلف ہیں اور ان کے محرکات بھی جداگانہ ہیں۔ میں نے شروع میں لکھا ہے کہ مسلمانوں میں مذہب و ملت کا اختلاف نہیں ہے اور ان کی مشکلات کا محرک بھی مذہبی اختلاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان میں محض معیشی اور معاشرتی اختلافات موجود ہیں۔ لہٰذا ان کی مشکلات کے محرکات بھی یہی معیشی اور معاشرتی اختلافات ہوں گے۔ موجودہ زمانہ میں ان مختلف قسم کی مشکلات کا اندازہ نہایت آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ کاشتکار چلا چلا کر پکار رہا ہے کہ وہ غریب ہے بھوکا ہے

تنگا ہے اور زمیندار کی بیرحمانہ سختیوں اور ناروا وصولیابیوں کا شکار ہے مزدور کی پرشکن پیشانی اور افسردہ چہرہ صاف صاف کہہ رہا ہے کہ وہ اپنی طاقت سے زیادہ دس گھنٹہ اور بارہ گھنٹہ کام کرتا ہے لیکن اس کی اجرت اس کا اور اس کی بیوی بچوں کا پیٹ نہیں بھرتی۔ اس کے بچوں کی تعلیم کا اور اس کی بیمار بیوی کے علاج کا انتظام نہیں ہوتا۔ دوسری طرف زمیندار شور مچا رہا ہے کہ اس کے ہاتھوں سے زمین چلی۔ ظلم وستم کرنے کے اختیارات چلے۔ اور سرمایہ دار چیخ رہا ہے کہ مزدوروں نے کام کے گھنٹے کم کرنے کے لئے اسٹرائک کیوں کی اور شرح منافع کیوں کم ہو گئی مشکلات دونوں فریقوں کو ہیں فرق صرف یہ ہے کہ ایک طبقہ کی مشکلات حقیقی میں اور زیست کا نظام قائم رکھنے کے لئے آہ وفغاں ہے اور دوسرے طبقہ کی مشکلات مصنوعی اور مفاداتی ہیں۔ اور اپنے غیر محدود منافع کم نہ کرنے کے لئے شور و فریاد ہے کسان زندگی کے لئے ترس رہا ہے اور تعلقدار عیش پرستوں کی ہوس میں ہے

ٹھیک مشکلات کی طرح مختلف طبقات کے خطرات بھی مختلف ہیں، مزدور کسان۔ دستکار، بے روزگار، اور دوسرے عام طبقات کے خطرات کچھ زیادہ گہرے اور باریک نہیں ہیں۔ وہ زندگی کی سخت اور کٹھن منازل سے گذر رہے ہیں اور ان کو صرف اپنی آخری بربادی اور موت کا خطرہ ہے اور برطانی سامراج اور اس کے ہندوستانی ایجنٹوں اور دلالوں سے لڑ رہے ہیں اس کے مقابلہ میں زمیندار۔ تعلقہ دار۔ ساہوکار۔ اور دوسرے سرمایہ دار طبقے

میں جو عوام کے انقلابی ارادوں اور اپنے حلیف برطانی سامراج کی روز افزوں کمزوریوں کو دیکھ دیکھ کر سہم رہے ہیں اور انھیں صاف نظر آرہا ہے کہ وہ ملک کے زندہ اور جاندار رجحانات کو اب زیادہ عرصہ تک نہیں دبا سکیں گے اور ان کو بہت جلد اپنے مصنوعی اقتدار اور جھوٹے تسلّط کے اڈے چھوڑنے پڑیں گے۔ پہلے طبقہ کے خطرات واقعی ہیں اور اس کی سادہ اور بے لوث تمنا موت سے نجات، دوسرے طبقہ کے خطرات مفاداتی ہیں اور اس کی آخری تڑپ اپنی سیمیں اور نشاط انگیز زندگی کا دوام۔ مزدور اور کسان بھی اپنی مشکلات اور خطرات کی اذیت محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن انکی زندگی جبل و فریب کی آلودگیوں سے پاک ہے لہذا وہ صفائی اور ایمانداری کے ساتھ علی الاعلان سامراجی مشین کے تمام پرزوں کے خلاف خواہ وہ نواب راجہ ہوں۔ یا زمیندار وساہوکار۔ جد و جہد کر رہے ہیں اور انکی شکایات، انکے ارادے اور مقاصد بالکل صاف اور واضح ہیں۔ اس کے برعکس سرمایہ دار طبقہ کی مشکلات اور خطرات چونکہ غیر حقیقی اور فرضی ہیں۔ اور اس کی زندگی بھی مکر و فریب اور شر و فتنہ کی گندگیوں سے بھرپور ہے لہذا اس کے اظہار کا طریقہ بھی غیر واقعی اور مکارانہ ہے آج سرمایہ دار طبقہ یہ ہرگز نہیں کہہ رہا ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کی انقلابی تحریک سے اس کے گندے مفادات کو خطرہ ہے اور اس کی نوابیاں اور تعلقہ داریاں خطرہ میں ہیں۔ اگر ایسا کہا جائے تو ایک حد تک معقول بھی ہو کیونکہ لوگوں کو یہ سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقعہ ملے کہ انقلابی تحریک فاسد ہے یا صالح اور ان کے مفادات قائم رکھنے کے

قابل ہیں یا تباہ کر دینے کے مستحق ہیں لیکن وہ عوام کی توجہ کو اصل سوالات سے ہٹاکر چند دوسرے فرضی خطرات اور مصنوعی مشکلات پیش کرتا ہے اور اس طرح خلط مبحث کر دیتا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ اپنے خطرات کو مذہب۔ تمدن۔ کلچر زبان اور اسلامی معیشت کے ابلہ فریب پردوں میں چھپا چھپا کر پیش کرتا ہے اور بھولے بھالے مسلمانوں کو یہ دھوکا دیتا ہے کہ اگر موجودہ معیشت معاشرت اور حکومت کے نظام میں ذرا سی بھی تبدیلی ہوگئی اور انقلابی رجحانات کو ابھرنے کا موقعہ مل گیا تو پھر مذہب۔ تمدن اور زبان کا ہندوستان میں کوئی نام لیوا بھی باقی نہ رہیگا۔ عام مسلمان سیاسی فہم نہیں رکھتے۔ وہ اپنے دشمنوں کو دوست سمجھ کر انکے خوشنا دھوکوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی ہاں میں ہاں ملاکر اپنی دشمن طاقتوں کو مضبوط کرتے ہیں۔

مشکلات کا حل

مسلمانوں کے مختلف طبقات کی مختلف مشکلات اور خطرات متعین کر دینے کے بعد اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مشکلات کا آخری حل کیا ہے۔ یہ عجیب پُرلطف بات ہے کہ اس نقطہ پر بھی سرمایہ دار طبقہ عجیب فریب کاری سے کام لیتا ہے اور جس طرح ہندوستان کے ۳۲ کروڑ مزدور کسان۔ دستکار اور بیروزگار یہ کہتے ہیں کہ ہماری مشکلات اور تباہی و بربادی کا پہلا اور آخری حل صرف یہ ہے کہ غلامی کا دور ختم ہو اور ہندوستان جلد آزاد ہو جائے۔ ٹھیک اسی طرح سرمایہ دار طبقہ بھی علی الاعلان کہتا ہے کہ غلامی لعنت ہے اور اس لعنت کے طوق کو کاٹ کر گلو خلاصی اور آزادی حاصل کرنا ہمارا سب سے بڑا مقصد ہے۔ سرمایہ دار طبقہ

صرف یہ کہنا ہی نہیں ہے بلکہ وہ جلسوں جلوسوں اور کانفرنسوں کے موقعوں پر کھدر کے کپڑے پہن کر غریبوں کے درمیان میں بیٹھتا ہے اور اپنی ریاست اور سرمایہ داری تک قربان کرنے کا یقین دلاتا ہے اور سطحی نظر رکھنے والے مسلمانوں کو یہ باور کرا دیتا ہے کہ وہ انکا خیرخواہ اور انہی میں سے ایک ہے۔ اس ملمع کاری سے سرمایہ دار طبقہ غریب مسلمانوں پر دودھاری تلوار چلا رہا ہے۔ ایک طرف وہ ان کو اپنی خیرخواہی کا یقین دلا کر اپنے خلاف محاذ تیار کرنے سے روکتا ہے اور دوسری طرف اپنی دولت۔ اور وسائل سے غریبوں کی استعمار دشمن تحریک کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ اس موقعہ پر ہمارے سیاست داں پھر ٹھوکر کھاتے ہیں اور وہ مختلف اور متضاد مفادات کو ایک جگہ جمع کر کے ان تمام مشکلات اور خطرات کا حل آزادی تجویز کرتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ آزادی ہی تمام ہندوستان کی اور بالخصوص مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کا حل ہے لیکن کیا یہ آزادی جو مسلمانوں کے مختلف اور متضاد مفادات کو ایک جگہ جمع کر کے حاصل کی جائیگی۔ وہی آزادی ہوگی جس سے کاشتکار بھی مطمئن ہو جائیگا اور زمیندار بھی؟ میرے خیال میں اس کا جواب نفی اور صاف نفی میں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ مسلمان سوسائٹی معیشی اور معاشرتی اعتبار سے مختلف طبقات پر مشتمل ہے اور ہر طبقہ کے مفادات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لہذا کاشتکار کا مفاد اور اسکی آزادی زمیندار کے مفاد اور آزادی سے سراسر مختلف ہوں گے۔ اسی طرح مزدور کی آزادی سرمایہ دار کی آزادی سے قطعاً جداگانہ ہوگی۔ کاشتکار کی حقیقی آزادی یہ ہے کہ اس کو اپنی زمین پر موروثی حقوق حاصل ہوں بیدخلی ممنوع ہو اور لگان

کم سے کم ہو۔ اور زمیندار کی آزادی یہ ہے کہ وہ اپنی زمین پر تمام مالکانہ تصرفات کا مجاز رہے۔ جب چاہے لگان بڑھا دے اور جب چاہے بیدخل کر دے۔ اسی طرح ریاستی رعایا کی آزادی یہ ہے کہ حکومت کے نظم و نسق میں اس کا حصہ ہو اور محاصل کا بیشتر حصہ رعایا کی بہبود و ترقی پر صرف کیا جائے۔ اس کے برعکس نواب صاحب کی آزادی یہ ہے کہ ریاست پر ان کا شخصی اقتدار قائم رہے رعایا سے زیادہ سے زیادہ ٹیکس لیں اور تمام روپیہ شراب و کباب رقص و سرود اور گھوڑ دوڑ میں صرف کر دیں۔ ظاہر ہے کہ جس طرح یہ دونوں طبقے اپنے مفادات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح ان کی آزادی بھی ایک دوسرے کی آزادی سے مختلف ہے جب نواب صاحب کی زبان پر آزادی کا نام ہوگا۔ تو اس کے معنی مزدور اور کسان کی مطلق غلامی کے ہوں گے۔ اور جب غریب کاشتکار اور بے روزگار کی زبان پر آزادی کا لفظ آئیگا تو اس کے معنی سرمایہ داری نظام معیشت اور سرمایہ داری نظام حکومت و مجلس کی تباہی کے ہوں گے۔ لہذا یہ نظریہ بالکل مہمل ہے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقات کو ایک مصنوعی جگہ پر جمع کر کے مطلق آزادی کو انکی مشکلات کا حل تجویز کیا جائے اور یہ تلخ حقیقت بالکل نظر انداز کر دی جائے کہ ایسی صورت میں اگر کبھی آسمان سے صحیفۂ آزادی نازل بھی ہوا جو عملاً ناممکن ہے۔ تو پھر وہ آزادی صرف سرمایہ دار طبقہ کی آزادی ہوگی اور مزدور دہقان طبقہ کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچیگا اس کی گردن سے برطانوی استعمار کا جُوا اتار کر خالص دیسی سامراج کا جُوا رکھ دیا جائیگا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے ۸ کروڑ غریب مسلمان ایسی آزادی کو کبھی اپنی مشکلات

اور خطرات کا حل پسند نہیں کر سکتے اور اگر کبھی اس قسم کی آزادی جبراً ہم پر مسلط کردی بھی گئی تو ان کی تحریک آزادی اپنے اسلامی بھائیوں کے خلاف بھی اسی طرح اور اسی قوت کے ساتھ جاری رہیگی جس طرح آج برطانی سامراج کے خلاف ہے۔ چونکہ بات اس حد تک آگئی ہے لہذا میرا یہ واضح کردینا بھی بے محل نہ ہوگا۔ کہ آج ہندوستان کے ۹ کروڑ غریب مسلمانوں کی سیاسی جد وجہد میں آزادی اور انقلاب کا جو تصور پوشیدہ ہے اس میں کسی نظام حیدرآباد۔ ظاہر شاہ۔ رضا شاہ پہلوی اور کمال اتاترک کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ ہمارا حقیقی سوال یہ نہیں ہے کہ ملک معظم برطانیہ سے ہمیں نفرت ہے اور کسی اسلامی فرمانروا سے محبت ہوگی۔ بلکہ حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ غریب مسلمان کسی ایسے سامراجی نظام حکومت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ جس میں تھوڑوں کا بھلا ہو اور کروڑوں تباہ و برباد ہوں یہ سامراجی نظام اگر ملک معظم برطانیہ کی حکومت میں ہوگا تو غریب مسلمان اس کے خلاف جنگ کریگا اور اگر شاہ فاروق مصر کی حکومت میں ہوگا تو اس کے خلاف جد وجہد کریگا۔

اس بحث سے دو باتیں صاف ہوگئیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کی مشکلات کا حل برطانی سامراج سے گلو خلاصی ہے اور دوسری یہ کہ غریب مسلمان کی آزادی سرمایہ دار مسلمان کی آزادی سے مختلف ہے۔ اب ہمیں آگے بڑھ کر یہ طے کرنا ہے کہ مسلمان آزادی کیسے حاصل کریں۔

ہمارا طریق کار

مسلمان کیا کریں؟ یہ سوال اب چھن کر اور صاف ہو کر اس حد تک آگیا کہ عام مسلمانوں کی مشکلات فقر و فاقہ بے روزگاری اور تباہی ہیں۔ ان مشکلات کا حل آزادی ہے۔ اور آزادی کے

حصول کا طریق کار اس وقت غور طلب ہے ممکن ہے کہ "مسلمان کیا کریں" پر غور کرتے ہوئے کسی کا ذہن اس طرف بھی منتقل ہو جائے کہ "مسلمان انگریزی حکومت کی حمایت کریں" لیکن میں اس پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں کیونکہ مسلمانوں نے اپنی گذشتہ سو سالہ زندگی میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ دیدہ و دانستہ انگریز کی حمایت پر عنوان اور کسی منہج تیار نہیں۔ لہذا یہ سوال ضلالت ہے کہ مسلمانوں کو انگریزی سامراج سے آزادی حاصل کرنا ہے اور آزادی حاصل کرنے کا طریقہ اس وقت زیر بحث ہے۔ ذہنی تقسیم کے مطابق سامراج دشمنی اور حصول آزادی کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں ایک مسلمانوں کی جداگانہ جدوجہد اور دوسرا ہندو مسلمانوں کا مشترکہ محاذ۔ ہماری خوش نصیبی اور بدبختی سے اس وقت ہندوستان میں دونوں تصورات کے مظاہر موجود ہیں ایک طرف مسلم لیگ ہے اور اس کے چند تصورات ہیں۔ دوسری طرف کانگریس ہے جس کے چند زندہ کارنامے ہیں۔ مسلم لیگ یہ بنیادی تصور ظاہر کرتی ہے۔ کہ مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم ضروری ہے کیوں؟ صرف اس لیے کہ مسلمان سیاسی طور پر منظم ہوں اور ہندو اکثریت میں ضم ہونے سے محفوظ رہیں اور آزادی کی جدوجہد میں ناقابل اعتبار حیثیت رکھنے کی بجائے مساوی اور باعزت طریق پر شریک ہوں۔ ممکن ہے کہ اس ایجابی تصور کے علاوہ کوئی دوسرا منفی تصور بھی جداگانہ تنظیم کا محرک ہو۔ مثلاً زبان و رسم الخط اور تہذیب و تمدن کے معاملات میں ہندوؤں کی تنگ نظری۔ بلکہ جارحانہ کوششیں اور اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں۔ میں ان تمام باتوں پر زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کروں گا۔ کیونکہ میرے نزدیک جس تصور کی بنیاد ہی فاسد ہو

اس کی عارضی خوشنمائیوں پر فریفتہ ہو جانا قرینِ دانش نہیں۔ میں مسلم لیگ یا مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی نظام ہی کو غلط اور غیر فطری سمجھتا ہوں اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ ایسے نظام کے محرکات سیاسی نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں بلکہ سراسر مفاداتی اور خود غرضانہ ہیں

اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لئے میں نے گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا ہے۔ اسکو مختصراً پھر دوہراتا ہوں تاکہ مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کی حقیقت واضح ہو جائے۔ میں نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمان معیشی۔ معاشرتی اور اقتصادی اعتبارات سے چند در چند طبقات میں منقسم ہیں اور ہر طبقہ کا مفاد دوسرے سے مختلف ہے لہذا ان متضاد طبقوں کو کسی معاشی یا اقتصادی و سیاسی نظام میں مربوط کر دینا ایک غیر فطری اور غیر تاریخی عمل ہے۔ اس نظام کے ہر طبقہ کی سیاست دوسرے طبقہ کی سیاست سے مختلف ہوگی۔ لہذا ایسے نظام میں کسی تندرست اور صالح سیاسی مزاج کا پیدا ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اس کے برعکس یہ تمام طبقات مذہب وملت میں متحد ہیں لہذا انکی تنظیم بھی مذہبی و ملی ہی ہو سکتی ہے اور وہ بالکل صحیح اور فطری ہوگی۔ مسلم لیگ کے نظام پر ایک نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کتنے مختلف اور متضاد طبقے اس میں نظر آتے ہیں ایک طرف راجہ محمود آباد اور نواب چھتاری ہیں اور دوسری طرف بیس روپیہ ماہوار کا کلرک اور ۵ بیگھہ زمین کا زمیندار ہے۔ مسلم لیگ کی لیڈری عوام کے ہاتھوں میں نہیں ہے بلکہ چند چوٹی کے نواب اور سرمایہ دار اس پر قابض ہیں انکو مسلم لیگ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان کے رجحانات سراسر مفاداتی اور حیثیت پسندانہ

ہیں۔ ان کو اپنے استعماری نظام کے کمزور اور بوسیدہ ڈھانچوں کی حفاظت درکار ہے اور اس کے لئے مذہبی پلیٹ فارم سے بہتر کوئی دوسرا پلیٹ فارم نہیں ہو سکتا؟ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا تمام سرمایہ دار طبقہ جو دور خلافت میں تحریک خلافت کا مخالف تھا۔ سول نافرمانی کے زمانہ میں کانگریس کا دشمن تھا اور مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے مقابلہ میں "اتحادی" اور "زرعی" پارٹیاں بنا رہا تھا آج عوام کے انقلابی اور جاندار رجحانات سے مایوس ہو کر بظاہر ابھی میں آتا ہے اور اپنی دولت اور دنیاوی ذرائع کی قوت پر اُن عناصر کی لیڈری کر رہا ہے جن سے اسے واقعی طور پر کوئی ہمدردی نہیں۔ گذشتہ ۲۰ برس کے تجربات نے مسلمانوں کے سرمایہ دار طبقہ کی پورانی چالوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ لہذا اب انھوں نے اپنے سامراجی مفادات کی حفاظت کے لئے وہ نیا عنوان اختیار کیا۔ جس سے عام سادہ لوح اور مذہبی مسلمانوں کو کوئی اختلاف ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اب ان لوگوں کی زبان پر مذہب۔ تمدن۔ کلچر اور زبان کا نام آنے لگا اور محمود آباد ہاؤس اور سلیم پور ہاؤس میں "اسلام خطرہ میں ہے" کے نعرے بلند ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان سوسائٹی کے اس اعلیٰ طبقہ کو اسلام کی حقیقی روح۔ اسلامی شعائر اور اسلامی خصوصیات سے نہ کبھی مناسبت تھی اور نہ ہو سکتی تھی اور نہ آجتک ان کو تمدن۔ کلچر اور زبان کے تصورات نے کبھی پریشان کیا تھا۔ لیکن آج انکو یہ نعرے اختیار کرنا پڑے۔ تاکہ مسلمانوں کے مزدور اور کسان طبقہ کی نہ سہی۔ لیکن متوسط طبقہ کی ہمدردیاں انھیں حاصل ہو جائیں۔ اور وہ مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی سستی لیڈری حاصل کرکے اس نظام کے ذریعہ آخری حد تک

اپنے استعماری مقاصد کی حفاظت کر سکیں۔ مسلمانوں میں اور دوسری سوسائٹیوں کی طرح تین طبقے ہیں۔ اعلیٰ طبقہ جس میں امرا۔ نواب۔ تعلقدار اور بڑے زمیندار شامل ہیں۔ متوسط طبقہ جس میں بیشتر شہری خوشحال لوگ، تاجر۔ وکیل۔ ڈاکٹر اور ملازمت پیشہ وغیرہ لوگ ہیں۔ ادنیٰ طبقہ جو غریب مزدوروں کسانوں اور دستکاروں پر مشتمل ہے۔ ادنیٰ طبقہ کے مفادات بھی زبان اور کلچر کی سطح سے نہایت اونچے ہیں۔ ان کے سرمایہ دارانہ مفادات محفوظ رہنے چاہئیں۔ چاہے ان کی معاشرت تمدن اور زبان ایشیائی اور ہندوستانی رہے یا مغربی اور انگریزی۔ اب صرف متوسط طبقہ ایسا ہے جو تھوڑی سی جد و جہد کے بعد آرام کی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے آپ کو اپنے مخصوص ماحول۔ معاشرت اور طرز بود و ماند سے اس قدر وابستہ کئے ہوئے ہے کہ اس میں ذراسی بھی تبدیلی کو گوارا نہیں کرتا اور اپنی تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی کے باعث ملک کے جاندار تقاضوں اور غریب مزدور و کسان کی جد و جہد کو اپنی زندگی کی مصنوعی خصوصیات کے لئے موت کا پیغام سمجھتا ہے۔ مسلمانوں کا متوسط طبقہ بے عمل بھی ہے اور بے سرمایہ بھی اور اعلیٰ طبقہ بے عمل ہے لیکن بے مایہ نہیں۔ اول الذکر کو اپنے مصنوعی مفادات کی حفاظت کے لئے سرمایہ اور لیڈر کی ضرورت ہے اور آخر الذکر کو اپنے سامراجی مقاصد کے لئے عوام کی ہمدردی اور عقیدت درکار ہے لہٰذا اس وقت مسلمانوں میں اعلیٰ اور متوسط دونوں طبقے ایک مرکز پر جمع ہونا چاہتے ہیں اور دونوں اپنے اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے "اسلام خطرہ میں" "اسلامی تہذیب خطرہ میں" اور "اردو خطرہ میں"، کے نعرے لگا رہے ہیں۔ مسلمانوں کا ادنیٰ طبقہ یہ مصنوعی

اور خود غرضانہ نعرے سنتا ہے لیکن وہ ہرگز کان نہیں دھرتا۔ کیونکہ اس کی جدوجہد کا جو رخ ہے وہ اعلیٰ طبقہ اور متوسط طبقہ کی جدوجہد سے سراسر مختلف ہے۔ سرمایہ دار طبقہ کا خیال ہے کہ اگر مسلمانوں کی زبان۔ تمدن اور مذہب کی حفاظت کی ضمانتیں دیدی جائیں تو ہندوستان کے مسلمانوں کا سوال حل ہو جائیگا۔ حالانکہ یہ خیال سراسر غلط اور خود غرضی پر مبنی ہے ایسی صورت میں مسلمانوں کی کوئی سیاسی تنظیم محض غلط اور فاسد ہی نہیں بلکہ غریب مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے مترادف ہے۔

مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی تنظیم سے غریب مسلمانوں کو جو نقصانات پہونچ سکتے ہیں انکا اندازہ مسلم لیگ کی موجودہ تحریکات اور انکے اثرات سے بخوبی ہو سکتا ہے مسلم لیگ کی تنظیم کے محرکات جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا تھا یقیناً اقتصادی اور سیاسی نہیں۔ بلکہ مذہبی اور فرقہ وارانہ ہیں۔ ہندوؤں سے نفرت اور دشمنی وہ سب سے بڑا محرک ہے جو آج مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع کر رہا ہے ممکن ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے سادہ لوح مسلمان اس غلط اور غیر صالح جذبہ کی بنا پر ایک جگہ جمع ہو جائیں لیکن کیا اس سے مسلمانوں کی آزادی کا مسئلہ حل ہو جائیگا۔ کیا اس منافرتی تنظیم کے جواب میں ہندو منافرتی تنظیم نہ کرینگے کیا اسی منافرت و دشمنی کا نتیجہ فرقہ وارانہ بلوے۔ فسادات اور ہنگامے نہ ہونگے؟ اور کیا اس غیر فطری تنظیم سے سامراجی طاقتوں کے ہاتھ مضبوط نہ ہوں گے؟ اور کیا اس جداگانہ تنظیم کی پالیسی سے مسلمانوں کی غلامی کا زمانہ آگے نہ بڑھیگا؟

ظاہر ہے کہ یہ تمام خطرات رونما ہوں گے جیسا کہ آج ہو رہے ہیں اور ہندوستان کی آزادی تو بجائے خود مسلمان غریبوں کی تباہی و بربادی روز بروز بڑھتی جائیگی میں نہیں سمجھتا کہ مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم ان مشکلات کو کیسے دور کرسکیگی اور وہ کس طرح برطانی سامراج کو ختم کرنے میں کامیاب ہوگی۔

ظاہر ہے کہ اس پالیسی اور طریق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صوبائی خودمختاری کا جو دور ہندوستان میں قائم ہوگیا ہے اس کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں گی اور آزادی کی منزل دور سے دور تر ہٹتی چلی جائیگی۔ میرا عقیدہ ہے کہ صوبائی خودمختاری قبول کر لینے کے بعد مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں اپنی تباہی و بربادی کا کنواں کھودا ہے اور دیدہ و دانستہ حکومت و اقتدار کے تمام سرچشمے ان لوگوں کو سپرد کر دیئے ہیں جن کی کارگذاریاں آج مسلمانوں کے لئے بےچینی اور پریشانی کا باعث ہیں۔ آج تمام مسلمان شور و فغاں کر رہے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور زبان کو فنا کر کے دو ہزار سال قبل کی تہذیب اور زبان کو زندہ کر رہا ہے اور اسے زبردستی مسلمانوں پر تھوپ رہا ہے لیکن کل گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے وقت مسلمانوں نے ان شدنی واقعات کا احساس نہیں کیا تھا اور پنجاب و بنگال میں اسلامی وزارتیں قائم کرنے کے شوق نے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا گیا اگر اسی وقت وہ جداگانہ تنظیم کی حماقت ترک کر کے ملک کے گرم اور انتہا پسند اور اشتراکی طبقوں کے ساتھ مل کر اس قانون کی مخالفت کرتے تو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ لیکن اس وقت تو مصنوعی اقتدار اور عارضی وزارتوں کا خناس

دماغوں میں سما گیا اور آخرکار خود اپنی تباہی کے اسباب پیدا کر دئے۔

میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ بلا شبہ آج کانگریسی حکومتوں میں بعض لوگوں کے خیالات "تعمیر" اور "اصلاح" کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور وہ اس "اصلاحی" دور میں انقلاب کی تیاری کرنے کی بجائے ہندی زبان۔ ہندو قدیم تہذیب اور اسی قسم کی دوسری غیر سیاسی اصلاحات میں مصروف ہو گئے ہیں لیکن میں ایک منٹ کے لئے بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ اگر کانگریس کے سوشل نظام میں کچھ غیر سیاسی چیزیں ابھر رہی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو مجھے بھی غیر سیاسی روش اختیار کر لینا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ جو لوگ اس وقت ہندی ہندوستانی کے سوالات سامنے لا رہے ہیں وہ بے لوث نہیں اس قسم کے سوالات سے ان کے مفادات وابستہ ہیں اور قطعی طور پر وہ ان پینتیس کروڑ غریب ہندو مسلمانوں کے دشمن ہیں جو اس وقت زبان۔ تہذیب اور کلچر کی غیر حقیقی الجھنوں میں پھنسے بغیر آزادی کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں اور ایک بڑے انقلاب اور بڑی اصلاح کی تیاری میں مصروف ہیں۔

میری نگاہوں میں روز روشن کی طرح یہ حقیقت واضح ہے کہ اس مصنوعی زبان اور غیر تاریخی تہذیب کو زندہ کرنے کے لئے جو کوششیں کی جا رہی ہیں وہ سراسر بے سود اور عبث ہیں جس وقت انقلاب ہوگا یہ تمام گندگیاں صاف ہو جائیں گی۔ اور عوام ہندو مسلمان اپنی نئی ضروریات کے مطابق اپنا نیا ادب اور نئی تہذیب تیار کریں گے۔ لہٰذا اس قسم کی غیر سیاسی حماقتوں سے اندیشہ کرنے

اور محض اس سبب سے مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی ضرورت محسوس کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی

ہمیں یہ بات صاف طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ اگر یہ خطرات صحیح اور پائدار بھی ہوں تب بھی مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی حدود میں رہتے ہوئے ان کو رفع نہیں کرسکتی۔ کیا مسلمانوں نے سی۔ پی، اور اڑلیسہ کی وزارتوں میں مسلم وزراء کے مطالبہ پر گورنروں اور وائسرائے کے خشک جواب کو فراموش کردیا اور کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جبتک ہندستان میں صوبائی خود مختاری کا دور باقی ہے اسوقت تک ان کے جائز یا غلط خطرات کا کوئی علاج ممکن نہیں۔ میرے خیال میں مسلمانوں کی ایک سیاسی غلطی وہ تھی کہ انھوں نے جداگانہ تنظیم کی الجھنوں میں پھنس کر صوبائی خود مختاری کو قبول کرلیا اور دوسری تخشش اور ناقابل تلافی غلطی یہ ہے کہ وہ آج بھی اپنی جداگانہ تنظیم سے نادانستہ طور پر فیڈریشن کو قبول کرنے کے امکانات بڑھا رہے ہیں اور انھیں ہرگز اس امر کا احساس نہیں کہ صوبائی خود مختاری کے نفاذ نے مسلمانوں کے لئے جو خطرات پیدا کردیے ہیں فیڈریشن کا نفاذ ان سے دس گنے زیادہ خطرات پیدا کریگا اور اس وقت ہندوستانی مسلمان کے اقتدار اور عظمت کی آخری جھلک بھی ختم ہوجائیگی

ان اصلاحات میں کوئی جداگانہ سیاسی تنظیم مسلمانوں کے لئے غیر مفید

ہی نہیں ہے بلکہ مضر اور سمِ قاتل ہے مسلمان یعنی ہندوستان کے ۸ کروڑ غریب مسلمان اگر کسی طریقہ سے اپنی مشکلات کو حل کر سکتے ہیں تو وہ صرف یہی ہے کہ جس طرح ان کی مشکلات معاشی اور اقتصادی ہیں اسی طرح ان کی تنظیم کے محرکات بھی معاشی اور اقتصادی ہی ہوں غریب مسلمان طبقہ وارانہ طور پر اپنی تنظیم کریں۔ تمام مزدور ایک جگہ ہوں۔ کسان ایک جگہ ہوں دستکار ایک جگہ ہوں اور بے روزگار ایک جگہ ہوں۔ مسلمانوں کے یہ تمام طبقے پھر اپنی مشترکہ جدوجہد کے لئے ایک بڑے پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور ملک کی تمام سامراج دشمن طاقتوں کے ساتھ اشتراک عمل کر کے برطانوی سامراج کا مقابلہ کریں۔ اور انقلاب کی تحریک کو زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھائیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مشترکہ پلیٹ فارم کونسا ہو۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں سامراجی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے آج نہیں۔ بلکہ پچاس برس سے کانگریس ہی ایک ایسا پلیٹ فارم ہے۔ جہاں ہندو مسلمان۔ سکھوں اور عیسائیوں سب ہی نے جمع ہو کر تحریک آزادی میں حصہ لیا ہے اور بڑی سے بڑی قربانیاں دی ہیں صرف اسی زندہ اور متحرک نظام میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ سامراجی طاقتوں سے ٹکرائے اور ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرا دے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کانگریسی نظام میں بھی بعض تھکے ہوئے۔ بہکے ہوئے اور رجعت پسند عناصر موجود ہیں اور وہ موقعہ موقعہ پر ہماری جاندار تحریک کو کمزور بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن چونکہ کانگریس کا پھیلاؤ غریب مزدوروں۔

کسانوں اور دستکاروں تک پہونچ چکا ہے اور اسمیں انقلابی تقاضے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ لہذا کسی کی رجعت پسندی یا خود غرضی سے اب کانگریس کو کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا اب ہماری تحریک کے جاندار تقاضے دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں اور رجعت پسند شخصیتیں دیکھتی آنکھوں پیچھے ہٹ رہی ہیں۔ اس سال کانگریس کی صدارت کے مسئلہ نے اس سوال کو اور زیادہ واضح کردیا ہے اور ملک کی اکثریت نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ اب ہمارے سامنے تعمیر اور اصلاح کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ انقلاب اور جنگ کا مقصد ہے۔

ان حالات کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے صحیح اور صائب طریق کار یہی ہے کہ وہ کانگریس میں شریک ہوں اور ملک کے انتہا پسند طبقوں کے ساتھ اپنا وزن ڈالکر ملک کو "تعمیر اور اصلاح" کی دلدل سے نکالیں مسلمان غریب ہیں۔ وہ کانگریس میں بھی غریب اور اشتراکی طبقوں کے ساتھ اشتراک عمل کریں اور اپنی مشترکہ انقلابی جدوجہد سے آزادی کی تحریک کو آگے بڑھائیں اگر اس طریق پر مسلمانوں نے اپنی تنظیم کی تو پھر اقلیت اور اکثریت کے وہ خطرات بھی پیدا نہوں گے جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کو ستایا کرتے ہیں اور کانگریس کے ان رجعت پسند عناصر کو بھی اُبھرنے اور ترقی کرنے کا موقعہ نہیں ملے گا جو اپنے مفادات کی خاطر بعض اوقات کانگریسی نظام میں بھی غیر سیاسی باتیں شروع کردیتے ہیں۔ اس کے علاوہ فیڈریشن مسلمانوں کے لئے جو خطرات لا رہا ہے ان کا بھی مداوا ہو سکے گا۔ مسلمان بحیثیت مجموعی کانگریس

کے استعمار دشمن طبقہ کے ساتھ مل کر فیڈریشن کی مخالفت کر سکیں گے اور جلد از جلد صوبائی خود مختاری کے اس عارضی اور فاسد دور کو ختم کر کے مکمل آزادی کی طرف بڑھ سکیں گے۔

مسلمانوں کے لیے صوبائی خود مختاری نے جو تباہیاں پیدا کر دی ہیں اور آئندہ جو نقصانات فیڈریشن سے ہونے والے ہیں ان کے پیش نظر میرا تو یہ قطعی خیال ہے کہ اگر آج ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل سے مسلمانوں کے بعض حقوق کو نقصان بھی پہونچتا ہو۔ تب بھی ہمیں پراونشل اٹانومی اور فیڈریشن کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے یہ نقصان برداشت کر لینا چاہیے اور کسی نہ کسی طرح ملک کی استعمار دشمن طاقتوں کو فیڈریشن کی مخالفت پر آمادہ کر کے اس ہلاکت آفرینی کے دور سے نکلنا چاہیے۔ ہندوستان کے ۸ کروڑ غریب مسلمان اچھی طرح سے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ اگر کچھ دنوں اور ہم زبان۔ تمدن اور کلچر کی مصنوعی اور غیر حقیقی الجھنوں میں پھنس کر ہندوستان کو آزاد نہ کرا سکے۔ تو ہندوؤں کو کوئی نقصان پہونچے یا نہ پہونچے لیکن وہ ضرور تباہ ہو جائیں گے اور انکی حالت اچھوتوں سے بھی بدتر ہو جائیگی دوسری بات یہ بھی سمجھ لیں کہ اگر آج کانگریس میں انہیں کچھ بے عنوانیاں نظر آرہی ہیں تو وہ کل کو انقلاب اور آزادی کے بعد ہرگز باقی نہیں رہینگی کیونکہ یہ بدعنوانیاں رجعت پسند متوسط طبقہ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اور انقلاب کے بعد طاقت اور حکومت غریب مزدوروں اور کسانوں کو حاصل ہوگی اور

اور اس وقت یہ بدبخت رجعت پسند طبقہ اور اس کی گندگیاں بالکل صاف کردی جائیں گی۔

آخر میں۔ میں یہ بات بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ جو مسلمان بعض مخصوص حالات کے پیش نظر اپنی جداگانہ تنظیم کو ضروری سمجھتے ہیں وہ کانگریس میں شریک ہو کر بھی اپنی تنظیم اور شیرازہ بندی کرسکتے ہیں لیکن اس تنظیم کے بنیادی محرکات سیاسی نہیں ہونگے بلکہ خالصتاً تبلیغی۔ تعلیمی اور مذہبی و ملی ہونگے۔ مسلمانوں کی یہ تنظیم ملک کے انقلابی تقاضوں سے متعارض نہیں ہوگی بلکہ اگر صحیح لائنوں پر کی جائے تو ان کی تقویت اور مضبوطی کا باعث بنیگی۔ اس قسم کی مذہبی و ملی تنظیم کے لئے موجودہ اخلاقی اور درحقیقت نہایت مفید اور سازگار ہے

محی الدین۔ قائد۔ بی۔ اے

اس سوال پر غور کرنے سے پہلے ہمیں کانگریس کی اصلی حیثیت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کانگریس ہندوستان کی ساری قوموں کی ایک مخلوط و مشترک جماعت ہے جس کے سامنے ہندوستان کی ساری قوموں کی سیاسی فلاح کا سوال ہے اس جماعت کو کسی مذہب و عقیدہ سے کوئی واسطہ نہیں، اس لیے صرف اس جماعت میں شامل ہو کر ہم اپنے تمام مسائل کا حل تلاش نہیں کر سکتے، مسلمانوں کے ایسے بہت سے اندرونی اور مخصوص مسائل ہیں جن کے متعلق کانگریس کے پلیٹ فارم سے کوئی آواز بلند نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے جو لوگ ملکی سیاست کے ساتھ اسلام کے دامن کو بھی ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے وہ صرف کانگریس میں شریک ہونے پر قانع نہیں رہ سکتے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ چاہے کانگریس میں شریک ہوں یا نہ ہوں لیکن ضروری ہے کہ آپکی کوئی مخصوص جداگانہ جماعت ہو، جو اسلامی مفاد، اسلامی کلچر، اسلامی عقائد اور زبان و رسم الخط وغیرہ کے تحفظ و ترقی کا کام انجام دے مسلمانوں کے لیے بہترین راستہ یہی ہے کہ وہ اپنا جداگانہ پلیٹ فارم بنائیں، اسے خوب مضبوط کریں سب سر جوڑ کر ایک جگہ بیٹھیں اور پھر مشترک ملکی مسائل کو طے کرنے کے لیے من حیث الجماعت کانگریس میں شریک ہو جائیں۔ لیکن ان کی یہ شرکت ایک ایسی "یک جان و صد ہزار قالب" جماعت کی شرکت ہو کہ اگر کہیں اسلامی مفاد کو ذرا بھی خطرہ پہنچنے کا اندیشہ ہو تو سارے مسلمان ایک آواز

ہو کر اس کے خلاف آواز اٹھائیں حتی کہ اگر ضرورت پڑے تو جس طرح ایک جان بن کر داخل ہوئے ہیں۔ اسی طرح ایک جان بن کر اس سے بھی باہر بھی آسکیں انتشار و پراگندگی کی حالت میں ایک ایک دو دو کر کے کانگریس میں شریک ہونا نہ صرف یہ کہ غیر پسندیدہ ہے بلکہ مسلمانوں کیلیے بے انتہا مضر بھی ہے۔ دیکھیے سکھ کانگریس میں شریک ہیں مگر اس کے باوجود انکا اپنا ایک جداگانہ مضبوط پلیٹ فارم ہے حتیٰ کہ ہندو جو اکثریت میں ہونے کی وجہ سے کانگریس کی کل کائنات پر چھائے ہوئے ہیں وہ بھی اپنی جداگانہ تنظیم سے غافل نہیں ہیں۔ ہندو مہا سبھا پوری آن بان کے ساتھ قائم ہے، چنانچہ دیکھ لیجیے کہ حیدرآباد کے مسئلہ میں کانگریس کی غیر جانبداری کے باوجود اس جماعت نے کیا کیا گل کھلائے اور اب بھی کیا کچھ کرنیکا دم داعیہ نہیں رکھتی۔

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ پہلے آزادی تو لے لو پھر مسلمانوں کی تنظیم بھی کر لینا وہ ایک نہایت خطرناک نظریہ کا پرچار کرتے ہیں اگر ہم آزادی لینے کے دوران میں مسلمانوں کو منتشر، پراگندہ حال اور خستہ و خراب چھوڑ دیں گے تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حصول آزادی کے بعد ہماری حالت اس ملک میں اچھوتوں کی سی ہو جائیگی ہمیں آزادی کیلیے جد و جہد ضرور کرنی چاہیے مگر اسی کے ساتھ ساتھ اپنے کلچر رسم الخط اور زبان وغیرہ کے تحفظ و ترقی کے سوال سے ایک لمحہ کیلیے بھی غافل نہ رہنا چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو گویا اپنی قومی و سیاسی خودکشی کو دعوت دیں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تو کیا پھر مسلمان کوئی نئی جماعت بنا کر اس میں شامل ہوں

یا موجودہ جماعتوں میں سے کسی ایک میں داخل ہو جائیں؟ اگر موجودہ جماعتوں میں سے کسی ایک میں داخل ہوں، تو کس میں؟

نئی جماعت بنانے کے سوال تو ہمیں مطلق غور نہ کرنا چاہیے اسلیے کہ خدا کے فضل سے اسوقت ہی اتنی جماعتیں ہیں کہ ان میں کسی نئی جماعت کا اضافہ کر کے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا کسی صورت سے مناسب نہیں ہو سکتا۔ لاہور میں "مجلس اتحاد ملت" بنی تو تھی، اس کا جو کچھ حشر ہوا اور ہو رہا ہے اس کے بعد ہم نئی جماعت بنانے کا خیال ہرگز نہیں کر سکتے اسلیے بہتر یہی ہے کہ اس وقت جو جماعتیں ہیں ان ہی میں سے جو بہتر ہو اسمیں داخل ہو کر اسے مسلمانوں کی صحیح نمائندہ جماعت بنانے کی کوشش کریں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں مسلم لیگ پر غور کرنا چاہیے اور نہایت ایمانداری اور صفائی قلب کے ساتھ اس حقیقت کو ماننے میں تامل نہ کرنا چاہیے کہ اس جماعت کے ارباب اقتدار میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کی تمام عمر انگریزی امپیریلزم کی حمایت کرتے ہیں صرف ہوئی ہے اس جماعت میں جو لوگ واقعی مخلص و بے لوث ہیں وہ یا تو اقلیت میں ہیں اور یا ذمہ دار افراد کی صف سے دور کھڑے ہیں۔ ایسے لوگوں کو نہ تو ورکنگ کمیٹی میں اکثریت حاصل ہے نہ کونسل آف ایکشن میں، اس قسم کے لوگ لیگ میں جانیکے بعد یا تو کٹھ پتلی بنکر رہ جاتے ہیں یا عضو معطل۔ اسلیے اس جماعت میں شریک ہونے کے معنی تو یہ ہیں کہ آپ فوجی بل پاس کرنیوالے "حامیان سرکار" کے ہاتھ میں اپنی نکیل دیدیں کیا مسلمان اسکے لیے تیار ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

دوسری جماعت جمعیت علماء ہے۔ اس میں جو لوگ ہیں وہ یقیناً مجاہد و سرفروش ہیں،

انگریزی امپریلزم کے خلاف جہاد کرنا اپنا نصب العین سمجھتے ہیں، انکی طاقت ایمانی اور قوت اسلامی سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر عسکری اور فوجی نظام اس جماعت کے پاس نہیں عوام سے براہ راست انکا کوئی تعلق نہیں، مغربی سیاست کی دو رخی باتوں کو بھانپنے والا اس میں کوئی بزرگ نہیں۔ اسلیے یہ جماعت بھی ہماری پیاس نہیں بجھا سکتی۔

اسکے بعد مجلس احرار کا نمبر آتا ہے، اسمیں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو جمعیۃ علماء میں ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ عسکری اور فوجی نظام کی بھی مالک ہے اسکے ذمہ دار افراد میں وہی مجاہدانہ و سرفروشانہ رنگ ہے۔ جو جمعیۃ کے افراد میں پایا جاتا ہے، ان کے پاس رضا کاروں کی کافی تعداد اور ایثار و قربانی کی ایک طویل و سبق آموز تاریخ ہے، اس جماعت کا نصب العین آزادی کامل کے ساتھ ساتھ مذہب کا تحفظ بھی ہے مسلمانوں کے آڑے وقت میں اُسنے کبھی جان کی بازی لگانیسے دریغ نہیں کیا۔ انگریزی امپیریلزم کے ساتھ ہمیشہ ٹکر لیتی رہی ہے مسلمانوں کی یہی ایک جماعت ایسی ہے جسکا براہ راست عوام سے تعلق ہے اور جس کا نظام بالکل کانگریس کے نظام کی طرح ہے،

پھر ہو سکتا ہے کہ اب بھی اسمیں کچھ خامیاں ہوں لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ مسلمان اس میں شریک ہو کر اس کی خامیاں دور کریں اور ہندوستان میں ایک منظم طاقتور اور باعزت قوم بنکر رہیں؟

محمد صدیق سالار جیوش احرار اسلام لاہور

آہ زمانہ کی نیرنگیاں بھی کیسی عجیب نیرنگیاں ہوتی ہیں۔ وہ مسلمان جسے خدا کی طرف سے صدہا سال پہلے سیاست، معاشرت اور معیشت کا ایک مکمل ضابطہ عطا کیا جا چکا ہے، آج حیرت و پراگندگی کے عالم میں ہر ایک سے پوچھتا پھرتا ہے کہ ہم کیا کریں؟ مسلمان اس دنیا میں خدا کا سپاہی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ جس کا کام یہ تھا کہ اپنے بھولے بھٹکے بھائیوں کو مساوات و حریت کا سبق سنائے انسانیت کے مرتبے کو بلند رکھے، ظالم و جابر قوتوں کا سر نیچا کرے عدل و انصاف کے جھنڈے کو اونچا رکھے اور دنیا میں جہاں کہیں بھی برائیاں اور بے انصافیاں ہو رہی ہیں وہاں اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر سراپا بغاوت بن جائے لیکن آہ کہ آج ہم اپنا فرض بھول بیٹھے۔ زندگی کی عشرتوں اور عافیت کوشی کی لذتوں نے ہم سے ہماری سرفروشی و جانبازی چھین لی اور آج ہم غلامی کی بوجھل زنجیروں سے دبے ہوئے ذلت و شکست کے ساتھ بے کسی و بے بسی کے عالم میں

"ہر اک سے پوچھتے ہیں کہ جائیں کدھر کو ہم!"

غلامی کی زندگی بسر کرتے ہوئے ہمیں ایک عرصہ ہو گیا۔ غلامی ہمیشہ اپنے مہلک اثرات نہایت گہرے طور سے دماغوں پر نقش کر دیا کرتی ہے جس سے ذہنیتیں بدل جاتی ہیں فرض شناسی کی حس کافور ہو جاتی ہے، قلوب کی روشنی فنا ہو جاتی ہے اور غلام جوشِ جہاد کے

مظاہرے کرنے میں شرم و ندامت کے بجائے فخر و شان محسوس کرنے لگجاتے ہیں اس وقت محکومی و غلامی کے یہ تاثرات ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی طبائع پر یکساں طریقے سے اثر انداز ہو چکے ہیں اور ان ہی جذبات کے ماتحت دونوں قومیں مشترک محاذ قائم کرنے سے عاجز و قاصر ہیں۔ سیاسیات کا ہنگامہ بپا ہے، کھلبلی مچی ہوئی ہے بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی ہیں۔ فہم و فراست کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ کھرے اور کھوٹے کو پیچیدگیوں کی کسوٹی پر پرکھا جارہا ہے۔ سارا ملک ایک متحدہ پلیٹ فارم قائم کرنیکے بجائے گروہوں میں تقسیم ہو گیا ہے ہر فرقے اور ہر قوم کے لاتعداد رہنما ہیں جو اپنی بازیگرانہ نقل و حرکت کا تماشا کر رہے ہیں عوام سیاسی الجھنوں سے ناآشنائے محض ہونیکے باعث بہت جلد دام فریب میں پھانس لیے جاتے ہیں، اور ہنگامی حالات کے ماتحت اُن سے فائدہ اٹھا کر پھر انھیں چھوڑ دیا جاتا ہو حکیم سب بنے پھرتے ہیں مگر نباض کوئی نہیں۔ نبض پر ہاتھ رکھ کر کوئی نہ کوئی نسخہ ضرور تجویز کر دیا جاتا ہے۔ اور بعض حکیم حقیقی بیماری کا پتہ لگانے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں اور نسخہ بھی ٹھیک لکھدیتے ہیں مگر دوا کی شیشی اٹھاتے وقت بے احتیاطی سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں اور تریاق کی بجائے زہر اٹھا کر مریض کے حوالے کر دیتے ہیں جس سے جاں بلب مریض موت سے اور زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ ہر قوم کا یہی حال ہو رہا ہے مسلمانوں میں خصوصی طور پر قحط الرجال ہے، سارے ملک کی آزادی کیلیے لازمی ہے کہ سارے ملک کی رائے ایک ہو۔ پلیٹ فارم مشترک ہو مگر ہندوستان میں ایسا نہیں ہو رہا۔ ہماری سیاست ہمارے لیڈروں کی ذاتیات سے تعلق رکھتی ہے جیسے ہی انکا ذاتی مفاد پورا ہوا ساری سیاست خود بخود ختم ہو گئی اسکے بعد پھر اگر کسی وقت ضرورت دامنگیر ہوئی تو چند حواری جمع کر لیے گئے۔ عہدے تقسیم ہوئے پمفلٹ چھپوائے گئے اخبارات میں

اعلان کیا گیا اور پیچھے نوکروڑ فرزندان توحید کے حقوق کی بھر حفاظت شروع ہوگئی۔ غرض آج طوائف الملوکی کا عالم ہے ہنگامہ ہے شور و شر ہے۔ آغاز ہے مگر انجام کا پتہ نہیں، جوش ہے اسٹیم ہے مگر ڈرائیور نہیں جو راستے سے اچھی طرح واقف ہو تاکہ سفر کے دوران میں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ غلط جوش سے غلط کام لیا جا رہا ہے اور راستہ سے ناواقف و ناتجربہ کار ڈرائیوروں کی وجہ سے جو حشر گاڑی کا ہوا کرتا ہے وہی حشر ہندوستان میں ہماری سیاست کا ہو رہا ہے۔

تاہم اگر سیکڑوں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں اور ٹولیوں سے قطع نظر کر کے ہم مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کو سمیٹنے کی کوشش کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ اسوقت ہمارے اندر چار بڑی جماعتوں کے داعی موجود ہیں (۱) کانگریس (۲) مسلم لیگ (۳) جمعیتہ علماء اور (۴) مجلس احرار۔

کانگریس کو معرض وجود میں آئے ہوئے باون برس ہوگئے اس عرصے میں ہندوستان کے اندر و باہر سیاسی حالات متعدد بار پلٹے مگر یہ جماعت ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں اپنی بساط کے مطابق ضرور حصہ لیتی رہی مسلمانوں نے جس جوانمردی اور جانفروشی کا ثبوت دیا وہ تاریخ کے صفحات پر زریں حروف میں تاقیام عالم روشن رہیگا۔ مسلم قائدین نے جس بے جگری سے مصائب و آلام کا مقابلہ کیا وہ ہر چھوٹے بڑے پر اچھی طرح روشن ہے کانگریس کی تاریخ کا کوئی باب مسلمانوں کے کارناموں سے خالی نہیں ہے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کانگریس کے اغراض و مقاصد پر قربان کر دی گئی لیکن افسوس کہ آج یہ قرار دادیں پاس کیجا رہی ہیں کہ پچاس سال کی محنت و عرقریزی کو فراموش کر دیا جائے اور جداگانہ تنظیم کی جائے۔ ہندو سے حق طلب کیے جا رہے ہیں جو خود ہماری طرح بلکہ ہم سے بہت مدت کا غلام ہے، جسکو طریق جہانبانی کا سلیقہ سیکھنے کیلئے مسلمانوں ہی کی طرف رجوع کرنیکی ضرورت ہے۔

لیکن اگر تیسری طاقت یونہی ہم دونوں پر مسلط رہی اور مسلمان صرف حقوق ہی کی جنگ لڑتے رہے تو ہندو سیاسی و تنظیمی لحاظ سے اپنی پوزیشن ایسی مضبوط کر لیگا جیسے اس نے ہمارے مقابلے میں انگریزی تعلیم سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہم آجتک یہ فیصلہ بھی متفقہ طور پر نہیں کر سکے کہ آیا ہمارے مذہب مقدس کے نزدیک انگریزی پڑھنا جائز ہے یا ناجائز۔ گویا ہم اس وقت تک ابھی لیکر مدرسے کو روانہ ہوئے جب ہندو تعلیم کے زیور سے مزین ہو کر نوکری کی معین مدت گزار کر اور پنشن لے کر گھر کو واپس آرہا تھا۔ پھر ہمارا اور اس کا مقابلہ کیسے ہو سکتا ہے اسی طرح موجودہ حالت میں اگر مسلمانوں نے جلد ہی کوئی فیصلہ نہ کر لیا اور ہندو حکومت کی مشینری کے کل پرزوں سے واقفیت حاصل کرنے میں ہمہ تن مصروف رہا تو بعد کو اگر حقوق کا فیصلہ بھی کر دیا گیا اور انگریز چلا بھی گیا تو ہندو سیاسی لحاظ سے بھی ہم سے زیادہ بیدار اور فرض شناس ہو جائیگا۔

کانگریس ایک مشترکہ جماعت ہے اس کی بنیاد کو مسلمانوں نے پختہ کیا جس کے بل بوتے پر آج یہ ایک عظیم الشان حیثیت اختیار کر چکی ہے پھر کیا اب ہمارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم اسے اتنی تقویت دینے اور اس پر سے ہزاروں جانیں قربان کرنیکے بعد آج فائدہ اٹھانے کے زمانے میں روٹھ کر علٰحدہ ہو جائیں۔ شاید یہ وقت کی سب سے خوفناک لغزش ثابت ہو جسے آج محسوس نہیں کیا جا رہا ہے، آئندہ چل کر اس کے نتائج و عواقب خود اپنی زبان سے مسلمانوں کے حیرت انگیز تساہل کو ظاہر کریں گے، آج شاید جوش غلامی کے مظاہرے کرنے والوں کو اس کا ذرہ بھر بھی احساس نہ ہو سکے مسلمان ایمان سے بھی محبت کرتا ہے اور آزادی وطن سے بھی۔ دوسرے فرقے اس کی راہ میں ہرگز حائل نہیں ہو سکتے کانگریس ہماری کوششوں کا نتیجہ ہے اور ہم ہی اس کی آئندہ کامیابیوں کا راز ہیں،

ہندو اگر غلطی سے مسلمانوں کی علیحدگی سے کسی حد تک مطمئن ہے تو اس کی حقیقت محض ایک خوش فہمی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہندو کی عارضی غلط روی اور غرور و تمکنت مسلمانوں کو ان کی اصلی شاہراہ سے کبھی نہیں ہٹا سکتی۔ جب بھی مسلمانوں نے ہوش سنبھالا اور کانگریس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا وہ کامیاب ہوں گے، اقلیت و اکثریت کا سوال نہ مسلمانوں کو مرعوب کر سکتا ہے نہ آئندہ کرے گا اور نہ اس کی کوئی مثال مسلمان کی گذشتہ تاریخ میں ملتی ہے۔ نہ ہندو نے ہمارا کچھ چھینا ہے اور نہ وہ چھین سکتا ہے۔ ہندوستان سے ہمارے تخت و تاج کو انگریز نے ختم کیا، ہماری جنگ بھی اسی دشمن سے ہو سکتی ہے، ہندو ہمارا غلام رہا ہے اور وہ غلامی کی زندگی پر قانع ہے اسکی فطرت میں غلامی رچی ہوئی ہے اس لیے مسلمانوں کو مل کر کانگریس میں شامل ہو جانا چاہیے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اپنے مخصوص معاملات کے لیے اپنی جداگانہ تنظیم کو برقرار رکھنا چاہیے، کانگریس کو ہماری جداگانہ تنظیم سے کوئی ضد نہیں ہو سکتی اور نہ ہونی چاہیے،

اگر یہ سچ ہے کہ اقوام و ملل کے سیاسی و مذہبی حقوق و مراعات کا تحفظ اُن کے توانا بازو اور اُن کے اعمال و کردار ہی کیا کرتے ہیں اور اگر یہ بھی سچ ہے کہ صرف باتیں بنانا رہنا ہلاکت و تباہی کا پیش خیمہ ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ مسلم لیگ کے ذی فہم اور اہل بصیرت افراد اپنی خطیبانہ ساحری لفظی جادوگری اور قرار داد بازی کا تماشا کر رہے ہیں؟ مسلم لیگ کے زعماء کا سارا زور بیان فعال اور باعمل مسلم جماعتوں کے خلاف دشنام طرازیوں اور افترا پردازیوں میں صرف ہو رہا ہے۔ تھیٹر کے بہروپ بھرنے والے پختہ کار اداکاروں کی طرح کبھی مسلمانوں کو مذہب کے نام پر اکٹھا کیا جاتا ہے اور کبھی مذہب سے سیاست کو الگ کر کے حقوق کی پائمالی کا واسطہ دیا جاتا ہے کبھی علماء حق کے خلاف زہر چکانی کی جاتی ہے اور کبھی عوام کی بےبسی کا رونا رویا

جاتا ہے مسلمانوں کو انتہائی بزدل بنایا جارہا ہے اور اسے کثرت و قلت کے خوف سے ڈرا کر
خوف اللہ سے باغی کیا جارہا ہے۔ اللہ کے سامنے اکڑنے اور افراد کے سامنے گڑگڑانے کا
سبق دیا جارہا ہے۔ المختصر مسلم لیگ کو قائم ہوئے تقریباً بیس سال ہوگئے مگر اس کا آجتک
دامن عمل سے خالی چلا آتا ہے حالانکہ مسلمانوں پر اس درمیانی عرصے میں ظلم و ستم کے لاکھوں
پہاڑ توڑے گئے اور آج بھی کچھ کم نہیں ہورہا ہے مگر مسلم لیگ کے کرسی نشین اور پادری
صفت رہنما ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ چند سرمایہ دار اور بے عمل حضرات کا مجموعہ ہے جسے
مسلم لیگ کہا جاتا ہے اور جو اپنے انجام کو مدنظر رکھتے ہوئے ہانپتے کانپتے اپنی مادر مہربان کے
پروں کے نیچے چھپ جانا چاہتے ہیں۔ یہ کانفرنسوں اور تقریروں کی گرماگرمی محض اسی وجہ
سے ہے۔ مگر انقلاب کے ریلے کو کون روک سکتا ہے! اس کی زد میں جو آئے گا خس و خاشاک
کی طرح بہہ جائے گا۔ مسلمانوں کو قلت و کثرت کے موہوم خطرات سے ڈرا ڈرا کر بزدل بنانا
مسلم لیگ کے زرین کارناموں میں سے ایک وہ کارنامہ ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

موجودہ عہد کا ضعیف الاعتقاد مسلمان خدائے قہار و جبار کی نصرت و اعانت کے بھروسہ کو
چھوڑ کر دنیا کے عاجز ترین بندوں سے اپنے حقوق کی حفاظت کا بیمہ کرانا چاہتا ہے؟ مگر کیا مسلمان
بتاسکتے ہیں کہ ہندوؤں نے یا کانگریس نے ان سے ان کے حقوق چھینے کب؟ مسلمانوں نے
ہندوؤں کو کیا بخشا؟ آخر یہ جھگڑا زلف یار کی طرح دراز کیوں ہوتا جارہا ہے؟ مسلمان اس
ملک میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے ہزاروں سال تک بلا امداد غیرے حکومت
کرتے رہے اور جب خدا کے انعامات کی قدر کرنے سے عاجز آگئے تو یہ نعمتوں کا دسترخوان
دوسری قوموں کے آگے چن دیا گیا۔ پھر ہندو جو خود ہزاروں سال سے محکوم چلے آتے ہیں اور
ہماری طرح غلام ہیں ہمیں کیا دے سکتے ہیں اور اُن سے کیا مانگا جاسکتا ہے؟ کیا فرزندانِ

تو ہندو نے اس امر پر کبھی غور نہیں کیا کہ ان کی حکومت کس نے چھینی؟ حقوق کس نے غصب کیے؟ آزادی کس نے سلب کی؟ یہ سب ضائع ہو جانے کے بعد مسلمانوں نے کبھی بھی ان کی واپسی کی خواہش اور کوشش کی؟ آہ! جب ہندو زمانے کے اثرات اور غلامی کی ذلتوں سے گھبرا کر اٹھنا چاہتے ہیں تو مسلمان جس کے ہاتھ میں آزادی وطن کا علم ہونا چاہیے تھا پوچھ رہا ہے کہ پہلے یہ بتا دو کہ ہمارا حصہ کس قدر ہوگا۔ ہندو دوڑ رہا ہے۔ مگر مسلمان راستے میں تھک کر گر گیا ہے اور چلا رہا ہے کہ دیکھنا اس دوڑ میں کبھی ہم اول رہا کرتے تھے۔ آج بھی ہمارا خیال رکھنا اور پہلا انعام نہ سہی دوسرا انعام تو ضرور ہم ہی کو ہماری روایات کے مطابق دینا۔

سوال یہ ہے کہ آج مسلمان غفلت کی جس نیند میں پڑے اینڈ رہے ہیں کیا وہ عارضی وقتی نیند ہے یا ابدی و دائمی! میں مایوسی پسند اور قنوطیت پرست نہیں ہوں، لیکن پھر بھی مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں مسلمانوں کا یہ خواب ایک ابدی خواب نہ ثابت ہو۔ اور یہ حالت جسے بیداری کہا جا رہا ہے بدخوابی نہ ہو! اور یہ چیخ و پکار محض بہکنا اور بڑبڑانا ہی نہ ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر کل تم بہت زیادہ مشہور دوڑنے والے تھے تو آج سے ہوشیار و ورزشی کھلاڑیوں کے مقابلہ میں بھی آگے نکل جاؤ گے۔ حرکت میں برکت ہے۔ سالوں کا جمود اور سکون لمحوں اور گھنٹوں میں کبھی دور نہیں ہوا کرتا۔ اور مسلمانوں کا یہ کہنا کہ ان کی شمولیت کے بغیر ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا محض ایک مجذوب کی بڑ ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی وقعت نہیں۔ لیگ کی شمولیت کے بغیر بھی ہندوستان نے دو تین سال کے عرصے میں کیا سے کیا کر دکھایا۔ لیگ فرنگی کے جابرانہ تسلط کو جائز رکھتی ہے اور ایک بھکاری بچے کی طرح جو تانگے پر جاتی ہوئی سواریوں کے پیچھے دعائیں کرتا ہوا بھاگتا

جاتا ہے اور پیسے مانگتا ہے۔ عاجزی سے اور بھی کھسیانی ہو ہو کر حقوق کی بھیک مانگ رہی ہے فقیر فقیر سے کیا سوال کر سکتا ہے۔ غلام غلام کو کیا دے گا اور کیا لے سکتا ہے۔ آہ آج مسلمانوں کے ضعف ایمانی کی یہ نوبت ہے۔ مسلم لیگ کے اردگرد عوام کا اجتماع ہو رہا ہے مگر یہ تھوڑے دن کی بات ہے سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ ہمارے بھولے بھائی جلد ہی جان لینگے کہ یہ جماعت کسی عملی پروگرام پر آمادہ ہو ہی نہیں سکتی۔ ان سروں، نوابزادوں، خان بہادروں اور صاحبزادوں کو تو صرف اپنا عیش چاہیے اور اپنی شان و شوکت جب کبھی کوئی مصیبتیں اٹھانے اور کڑیاں جھیلنے کا وقت آئے گا یہ سب عوام سے بہت دور جا کھڑے ہوں گے۔ فتح اسی کی ہوگی جس کے بازوؤں میں کس بل ہوگا۔ اور جسے اپنے پر اعتماد ہوگا لیکن مسلم لیگ کا نہیں

نازنیں را عشق ورزیدن نہ زیبد جان من + شیر مردانِ بلاکش بادریں غوغا نہند

اگر مسلمانوں کو اپنی جداگانہ تنظیم کی ضرورت ہے اور مسلمان فی الحقیقت جداگانہ طور پر بھی زندہ رہنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ مسلمان جمعیۃ علماء اور مجلس احرار کے مخلص، ایثار پیشہ، ایماندار اور جفاکش مجاہدوں کے دامن سے وابستہ ہو جائیں، احرار اور جمعیت حقیقت میں ایک ہی تخیل کے دو نام ہیں۔ گزشتہ چوتھائی صدی سے یہ دونوں جماعتیں جس سرگرمی اور مجاہدانہ اسپرٹ کا ثبوت پیش کرتی رہی ہیں اس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اس وقت ہندوستان میں اگر کوئی اسلامی کام سرانجام دیا جا سکتا ہے تو صرف انھیں دونوں اداروں کی سرپرستی میں۔ مسلمانوں کو ان کے خلوص پر اعتماد، ان کی نیتوں پر بھروسہ اور ان کی جانفشانیوں پر پوری طرح یقین رکھنا چاہیے۔ آزادی وطن کی راہ میں وقتاً فوقتاً جو گراں قدر قربانیاں

ان جماعتوں کے افراد دیتے رہے ہیں وہ ہندوستان کی تاریخ کا زرین باب کہلائی جاسکتی ہیں۔ قید وبند کی تکالیف اور دوسری جانی اور مالی قربانیوں سے ان کی تاریخ کا ہر ورق بھرا ہوا ہے۔ یہ باعمل ہیں فعال ہیں۔ ان میں گرامی قدر اور جید علماء ہیں وہ علماء جو درحقیقت آج کفرستان میں مشعل ہدایت کا کام سرانجام دے رہے ہیں اس لیے مسلمانوں کو ان جماعتوں کی سرکردگی میں کانگریس میں شمولیت اختیار کرنی چاہیے تاکہ آزادی وطن کا مسئلہ بہت جلد حل ہو جائے۔ مگر یہاں اتنا اور عرض کر دوں کہ ان دونوں جماعتوں کو پہلے ملکر ایک ہو جانے کی ضرورت ہے جب یہ دونوں ایک ہو جائیں گی اور مسلمان اپنی اسلامی تنظیم کیلیے اُن کی ہدایت و سرپرستی میں کام کریں گے تو پھر کانگریس حقیقت میں ہندوستان کی اور مشترک جماعت قرار پائے گی اور ہندوستان اپنے شاہد مقصود سے بہت جلد ہمکنار ہو جائے گا۔

لعل دین عاصی صحافی ملتان

ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی تہذیب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ عام تمدن و معاشرت میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے اس لئے کوئی حقیقی اتحاد یا قومیت مشترکہ کی تعمیر مشکل ہی نہیں ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ مذہبیات سے قطع نظر ملت کے تہذیبی امتیاز نے حالات کو اس حد تک پہونچا دیا ہے کہ دونوں میں سے ایک بھی اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے امتیاز کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ دونوں کو ہندوستان ہی میں رہنا ہے اب سوال صرف یہ ہے کہ دونوں غلامانہ زندگی بسر کریں یا آزاد ہندوستان میں عزت کی آزاد زندگی۔

یہ تو کوئی مسلمان بھی نہیں کہہ سکتا کہ موجودہ حالات ہمارے اطمینان کے لئے کافی ہیں۔ یا ہم انگریز کی دائمی غلامی کا پٹہ لکھنے کے لئے آمادہ ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ آنے والے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو تہذیبی اور تمدنی دشواریاں نظر آتی ہیں۔ اسلئے مسلمان مجبور ہیں کہ جب قومیت مشترکہ کے سیلاب میں وہ اپنی ملی خصوصیات کو غرق کرنے کے لئے تیار نہیں تو کوئی ایسا سمجھوتہ یا معاہدہ کریں جس میں ان کے یہ امتیازات فنا نہ ہونے پائیں۔ حالات کے محض یاس انگیز پہلو ہی پر نظر کرنا اور اس کی دشواریوں سے ہمت چھوڑ دینا کوئی قابل تعریف جذبہ نہیں ہے۔ جو بزرگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تمدنی اور تہذیبی اختلافات کی وجہ سے کسی اطمینان بخش فضا کی امید نہیں، اس لئے ہندوستان کے حالات کا کوئی حل بھی دریافت نہیں ہو سکتا، وہ دوسرے الفاظ میں یہ تعلیم دیتے ہیں کہ موجودہ غلامانہ زندگی ہی پر صبر و شکر کرنا چاہیے لیکن نوجوانان

ہندوستان کے مسلمان اس قسم کی ہتک آمیز زندگی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اسلئے ہمیں تصویر کا دوسرا رخ تلاش کرنا چاہئے۔ یا اگر نہیں ہے جو ان خطرات کو فنا کردے جنہیں آج ہم بہت اہم احساس کر رہے ہیں۔ تہذیبی اور جذباتی اختلاف بہت سخت اختلاف ہیں لیکن ہم جس ماحول میں اس وقت ہیں اس کے نقصانات اس سے بھی زیادہ اہم ہیں آج جو دشواریاں درپیش ہیں وہ دنیا کے لئے بالکل نئی نہیں ہیں دنیا کے اور بہت سے ملک بھی ایسے ہیں جہاں اقلیتوں کا سوال اتنا ہی پیچیدہ ہے مگر اس کے باوجود وہاں ان پیچیدگیوں کا حل تلاش کر لیا گیا ہے اگر ہم بھی کوشش کریں تو اس کا حل تلاش کرنا ناممکن نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا کے دوسرے ممالک میں اکثریت کی طرف سے جو فیاضانہ سلوک کئے گئے ہیں وہ ہندوستان میں ممکن نہیں۔ لیکن پھر بھی مطلقاً کسی معاہدہ کو ناممکن نہیں سمجھا جا سکتا۔ جو لوگ مسلمانوں کو خالص تہذیبی دوار کی مشکلات میں پھنسا کر آزادی کی جدوجہد سے الگ رکھنا چاہتے ہیں ان کا منشا برطانوی امپریل ازم کی بالواسطہ تائید کے سوا کچھ نہیں۔ بہر حال اصل سوال یہ ہے کہ ہماری کوششیں کس عنوان سے ہونی چاہئیں مسلمانوں کی تنظیم اور متحدہ جماعت کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جب نظام حکومت دو مختلف تہذیب و تمدن والی قوموں کے ہاتھ میں ہوگا تو اپنی ملت کی صحیح نمائندگی کے لئے یقیناً ایسی مجلس کی اشد ضرورت ہے جو پوری قوم کی ترجمان ہو اور مسلمانوں کی عام تہذیب اور مخصوص مذہبیات کی حفاظت کر سکے لیکن اس قسم کی انجمن داخلی نظام کے لئے تو ضروری ہے لیکن آزادی اور طلب حقوق کی جنگ ہندوستان کی اندرونی جنگ نہیں ہے بلکہ مشترکہ طور پر ایک تیسری قوت

سے اپنے مطالبات کو پورا کرانے کا سوال ہے اس لئے اگر ہم ہر حیثیت سے ہندوستان میں دو جداگانہ نظام قائم کرنے کی کوشش کریں تو ہمیشہ تیسری طاقت فائدہ میں رہے گی۔ مثال کے طور پر فوجی بل کو لیجئے۔ اگر پلیٹ فارم مشترک ہوتا تو یہ نوبت کبھی نہ آتی کہ حکومت اپنے منشا کے مطابق اس بل کو منظور کرا لیتی بلکہ ملک کی متفقہ آواز کے سامنے خواہ وہ کچھ بھی ہوتی حکومت کو جھکنا پڑتا۔

پھر یہ ممکن ہے کہ حکومت مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے پنجاب وغیرہ میں کچھ مسلم تناسب کو بڑھا دے لیکن اگر کل کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے جس میں حکومت کی مخالفت کرنی پڑے اور ہندو یا کانگریس لیگ کے خلاف حکومت کا ساتھ دے تو انگریز اپنے مفاد کے پیش نظر ادھر ہی طرف جھک جائیگا۔ بہرحال میرا مقصد یہ ہے کہ تنظیم کی تو یقیناً ضرورت ہے لیکن ہندوستان کی آزادی کے لئے کوئی مشترکہ نظام ہونا ضروری ہے۔ اور اس لئے مسلم لیگ داخلی جدوجہد کی جماعت تو بن سکتی ہے لیکن عام جدوجہد آزادی کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے تو ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو مختلف اقوام کی متحدہ آواز پیدا کر سکے۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ کی موجودہ شیرازہ بندی ان عناصر سے ہوئی ہے جو آج تک کبھی آزادی پسند بزرگوں کے ساتھ جمع نہیں ہوئے یہ کہدینا تو آسان ہے کہ قوم پرور لوگ یا آزادی کے لئے براہ راست عمل کرنے والے بزرگ اجتماعاً مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کی کمزوریاں دور کریں۔ مگر عملاً یہ چیز اس وقت بہت دشوار ہے۔ مسلم لیگ اور کانگریسی مسلمانوں کی لاگ اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ یہ لوگ اگر لیگ کے ممبر بھی ہو جائیں پھر بھی نہ محض لیگ کا اقتدار اعلیٰ

ہی ان سے مشکوک رہے گا بلکہ عوام میں جو کچھ غلط پروپیگنڈا ہو چکا ہے اس کی وجہ سے وہ بھی ان سے مطمئن نہیں ہوں گے اور خود لیگ دو چھوٹے بڑے گروہوں میں منقسم ہو کر سیاسی اکھاڑہ بن جائے گی۔ اس کے بعد اکثریت والا بازو یقیناً کمزور بازو کو الگ کر دے گا۔ یہ صحیح ہے کہ ہر جماعت میں دو بازو ہوتے ہیں اور وہ برابر اپنا کام کرتے ہیں لیکن مسلم لیگ میں یہ صورت اس لئے ممکن نہیں کہ اس کے دو بازو اصل الاصول ہی میں ایک دوسرے کے خلاف ہوں گے۔ اس لئے نہیں بنایا سخت دشوار ہے کانگریس کے دو بازو آزادی ملک اور عملی جدوجہد میں تو ہم خیال ہیں محض طریق کار کے متعلق ایک دوسرے سے جنگ کرتے ہیں لیکن لیگ کے یہ دو گروہ تو بنیادی طور پر مختلف راستوں پر چلیں گے رجعت پسند جو لیگ کے مجلس علیہ میں نہ محض موجود ہیں بلکہ برسر اقتدار بھی ہیں کسی حالت میں جنگ آزادی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ اگر ایک دوسرے کو جماعت سے الگ بھی نہ کریں پھر بھی اس وقت اکثریت چونکہ رجعت پسند اور معتدلین کی ہے اس لئے دوسرے خیال کے لوگ بھی وہاں جا کر قطعاً معتدل ہو جائیں گے۔

میں یہ مانتا ہوں کہ کانگریس میں اسوقت اکثریت اس قسم کے لوگوں کی ہے جو فیاضی تو درکنار صحیح رواداری کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ عام روزمرہ کے واقعات ہی پر ان کا تعصب ختم نہیں ہو جاتا بلکہ مستقل طریقہ سے وہ ہمارے تمدن و تہذیب کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے مقابلہ میں ہزاروں سال کی قدیم تہذیب اور زبان ہم پر مسلط کر سکتے ہیں اس کے قبول کرنے کے لئے

قول وعمل کے ذریعہ اور حکومت کے زور سے مجبور کرنا چاہتے ہیں بعض کانگریسی بندگی یہ خیال کرتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے بعد یہ سب جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے اس وقت ہندوستان کی جدید تعمیر ہو رہی ہے اقوام کے بننے اور بگڑنے کا وقت وہی ہوتا ہے جب ملک کی سیاسیات میں انقلاب آیا کرتا ہے۔ اس لئے ہمارے بننے اور بگڑنے کا بھی یہی وقت ہے ہمارا انقلاب تدریجی انقلاب ہے۔ اس وقت جو تہذیبیں زندہ کی جائیں گی وہی آئندہ آزاد ہندوستان کی مستقل تہذیبیں ہوں گی۔ پھر یہ حقیقت ہے کہ جہاں کانگریس کا اقتدار ہے وہاں ہندو تمدن وتہذیب کی بنیادیں آہستہ آہستہ رکھی جا رہی ہیں اگر اس وقت ہم نے اپنے تمدن وتہذیب کو نہ سنبھالا تو یقیناً آنے والے دور میں ہم ہمیشہ کے لئے اپنے امتیازات کھو دیں گے۔ یہ امید رکھنا کہ آزاد ہندوستان میں ہم اپنی تہذیب کو زندہ کر لیں گے محض فریب نفس ہے۔ آج جس بنیاد پر تعمیر شروع کی جائے گی مستقبل میں وہی مکان تیار ہوگا جس آج ہی فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارا تمدن کس طرح محفوظ رہے گا۔

کانگریس کہتی ہے کہ شمالی ہندوستان کی زبان ملک کی زبان ہوگی لیکن اسی کے ساتھ اس میں نہایت تیزی کے ساتھ سنسکرت الفاظ کی بھرمار کی جا رہی ہے اگر یہ رفتار جاری رہی تو دس بارہ سال میں آدھی سنسکرت ملی ہوئی زبان ہی شمالی ہندوستان کی زبان کہلائے گی۔ یہ الفاظ دیگر مسلم تہذیب کا جو اثر زبان پر ہے اس کو ختم کر دیا جائے گا۔ یہی ہے وہ تدریجی تعمیر جس میں اغیار بنتے رہیں گے اور ہم مٹتے جائیں گے اس لئے کانگریس میں بلا شرط شمولیت کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔

الغرض یہ مخصوص نقائص ہیں جو ہمیں دونوں سیاسی جماعتوں میں نظر آتے ہیں ایک طرف آزادی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے تو دوسری طرف اپنے تہذیب وتمدن سے لیکن پھر طریق کار کیا ہونا چاہیئے؟ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ ایک طرف تو لیگ میں کچھ تغیر وتبدل ہونا چاہیئے۔ اور دوسری طرف کانگریس سے موجودہ حالت کے ماتحت معاہدہ کی تکمیل ضروری ہے اس وقت مسلم لیگ کا فرض ہے کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے موجودہ افتراق کو ختم کرائے۔ وہ بلا شبہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ اس لئے اسی کا فرض ہے کہ وہ کانگریس احرار جمیعۃ العلماء اور دوسری قابل اعتبار انجمنوں کے اکابر کو ایک جگہ جمع کرکے اس اختلافات کو مٹانے کی سعی کرے۔ اور سب مل کر ایک ایسی جماعت اور ایسا دستور مرتب کریں جو تمام مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو۔ اس کے بعد ایک متفقہ سمجھوتہ کانگریس کے سامنے رکھیں جسے قبول کرنا اس کے لئے ناگزیر ہوگا۔

بعض بزرگوں کا یہ خیال ہے کہ سوشلزم میں اگر مناسب حال تغیر کردیا جائے تو یہ ہماری مشکلات کا صحیح ترین حل ہوگا. یعنی سوشلزم کو محض اقتصادیات تک محدود کردیا جائے۔ اور ہر قوم اپنے مذہبی اعمال میں آزاد ہو۔ بہ الفاظ دیگر مارکس ازم اور لینن ازم سے مذہبیات کی مخالفت کو نکال کر اسکا معاشی پہلو لے لیا جائے۔ یہ چیز اصولاً تو صحیح ہے لیکن ہندو اور مسلمانوں کو اس حد تک آزاد خیال کرنا کہ ایک دوسرے کے مذہبی افعال سے متعارض نہ ہوں بجائے خود بہت اہم اور دیر طلب کام ہے اس کے علاوہ جو طبقہ کانگریس میں اس وقت برسر اقتدار ہے وہ کبھی ہم سائی سے اس خیال کو پورا نہیں ہونے دیگا۔ دوسرے یہ اشکال بھی ہے کہ جو

لوگ سوشلزم سے ناراض ہیں وہ پھر مذہب کے نام پر وہی کچھ کریں گے جو اس وقت تک کانگریس کے مقابلہ میں کیا جا چکا ہے اور مسلمانوں کو موجودہ جدوجہد سے الگ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لئے میرے نزدیک سوشلزم ہماری مشکلات کا صحیح حل ہرگز نہیں بن سکتا۔ بحالات موجودہ مسلمانوں کی سیاسی تربیت ہونے تک ہمیں ایک ایسے سمجھوتہ کی ضرورت ہے جو ہمیں ہمارے تہذیبی امتیازات کے بقا کا کامل یقین دلائے۔

(حکیم محمد مسعود رام پوری)

بدقسمتی سے جب ہندوستان کی حکومت و اقتدار کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین لی گئی، خاندان مغلیہ کا چمکتا ہوا آفتاب جو کبھی ہندوستان کے طول و عرض کو اپنے نور سے منور کر رہا تھا۔ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ بنکر لال قلعہ دہلی میں محصور و مقید ہو گیا، حاکم محکوم بنے اور آقا غلام ہو گئے، انگریزی حکومت نے ہر ممکن عیاری اور چالاکی سے لوٹ کھسوٹ شروع کی اور ہندوستان کی لہلہاتی ہوئی وادیوں سے مال و دولت کو چوس چوس کر دریائے ٹیمز کے کنارے پہنچانا شروع کیا، نصاریٰ کے سرداروں و افسروں کا حکم بے دریغ جاری ہوا، مسجدوں کو جو خانۂ خدا ہیں بے تکلف مسمار اور خراب کیا جانے لگا، دہلی سے لیکر کلکتہ تک عیسائیت کا عمل دخل پھیلا۔ ہاں تو اس وقت جب ہندوستان پر مصیبت کے یہ بادل چھائے ہوئے تھے خاندان شاہ ولی اللہ کے چشم و چراغ اور علماء ہند کے سرتاج رئیس المحدثین حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ نے سر ہتھیلی پر رکھ کر ڈنکے کی چوٹ یہ فتویٰ صادر کیا "دہلی دار الحرب کا حکم رکھتا ہے۔ انگریزوں اور ان جیسے کافروں کے سارے مقبوضات بلاشبہ دار الحرب ہیں" (فتاویٰ عزیزیہ ص ۱۶۲)

لیکن آہ کچھ عرصہ بعد یہ قبضہ پنجاب و سرحد تک بڑھ گیا اور دار الحرب کے حدود کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ اگرچہ غلامی کا یہ طوق مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کے گلے میں بھی ڈالا گیا تھا اور دونوں ایک ہی طرح لٹتے اور تباہ و برباد ہوتے تھے اور دونوں ایک ہی خونیں پنجہ کا شکار ہو رہے تھے لیکن ہندوؤں کے دماغوں سے آٹھ سو سالہ محکومی کی بنا پر نشہ حکومت و سرداری اتر چکا تھا البتہ مسلمان تاج و تخت

اور سلطنت وجہانبانی سے ابھی ابھی محروم کیے گئے تھے اسلیے قدرتاً وہ اس انقلاب سے بہت زیادہ متاثر
اور برگشتہ حال تھے چنانچہ اُس وقت جبکہ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ چکے تھے حوادث کے تیروں سے
دل چھلنی ہو رہے تھے، مذہب وملت کی تباہی و اسلامی شعائر کی بربادی کا دردانگیز سماں آنکھوں
کے سامنے تھا، بڑے بڑے شریف زادے ذلت و غلامی کے گہرے گڑھوں میں گرائے جا رہے تھے علمائے کرام
کے سامنے یہ سوال پیش ہوا کہ "مسلمان کیا کریں" اور اس سوال ہی کا جواب تو تھا جو کہ ۱۸۵۷ء کے
جہاد کی شکل میں منظر عام پر آیا، مگر قسمت نے یاوری نہ کی مشیت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔
بدنصیبی سے یہ چال کامیاب نہ ہو سکا۔ بلکہ اس کے بعد ظلم و ستم کی تلوار اور تیز ہونے لگی۔ استبداد و بہیمیت
کا خوب مظاہرہ ہوا مسلمانوں کو اپنے منحوس ارادوں اور ظالمانہ نیتوں کی راستہ میں زبردست
روڑا سمجھ کر انھیں خوب پیسا گیا۔ ان کے دلوں سے جذبہ جہاد کو کچل پھینکنے کی تدبیریں شروع ہوئیں
جن علمائے کرام نے ایک مذہبی فریضہ اور ملک اور قوم کی خدمت سمجھتے ہوئے "مسلمان کیا کریں" کا جواب
سوچا تھا اُن کو پھانسیوں پر لٹکایا گیا، جزائر انڈمان اُن سے آباد کیے گئے بعض حضرات جلاوطن
ہوئے۔ اور مجاہدین سرحد کے ساتھ جا کر مل گئے لیکن وہاں بھی وہ چین سے کیسے رہ سکتے تھے۔
سرحد میں فوج کشی شروع ہوئی اور یہ سمجھا گیا کہ ان طریقوں سے جو ہندوستانی مسلمان وہاں
رہ پڑے ہیں یا وہ ہندوستان واپس چلے جائیں گے چنانچہ سنہ ۱۸۶۳ء کی مہم کے بعد یہ کہا گیا کہ:-

"پنجاب گورنمنٹ کو افسوس رہا کہ یہ مہم ختم ہو گئی اور ہندوستان کے مذہبی مجنون نہ تو نکالے
جاسکے اور نہ انھیں مطیع کر سکے اُن کو ہندوستان واپس کر سکے (مسلمانان ہند صفحہ ۱۲۱ بحوالہ مسلمانوں
کا روشن مستقبل)

اس کے بعد یہ کوشش شروع ہوئی کہ جسم کی طرح دماغ کو بھی قبضہ میں لانے کا بندوبست
کیا جائے۔ دماغوں سے حکومت کا نشہ اُتار دیا جائے۔ ذہنوں سے غلامی کی ذلت کا احساس

اور قلب سے گزشتہ دور سعادت و حکمرانی کا نقشہ مٹایا جائے تاکہ آئندہ کے لیے ایسے ہنگاموں کے خطرات سے اطمینان و سکون حاصل ہو جائے جو کہ تنگ نظری کی تعلیم پائے ہوئے علماء اور جاہل مسلمانوں سے" سرزد ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی جیمز مسٹر ای سی بیلی سکریٹری گورنمنٹ ہند کی تحریر سے ظاہر ہے۔ لکھتا ہے

"ان کی مذہبی دیوانگی جس کے لیے قرآن سے کافی سند مل سکتی ہے بہت بھڑکا دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اب اندیشہ ہے کہ کل مسلمان بہت جلد باغی ہو جائیں گے جن میں مذہبی مجنون، جہلا اور تنگ نظری کی تعلیم پائے ہوئے علماء شامل ہونگے جو واجبی طور پر حکومت سے ناراض ہیں اور جاہل مسلمانوں پر بیحد اثر رکھتے ہیں۔"
(مسلمانان ہند صفحہ ۱۵۱ بحوالہ روشن مستقبل)

پس اسی فتنہ کے اُتارنے کے لیے لارڈ میکالے کی رسوائے عالم تعلیمی اسکیم کا آغاز ہوا اور راس زہر ہلاہل کو مختلف رنگ کی بوتلوں میں بھر کر مسلمانوں کو پلایا جانے لگا۔ یہ بھی ابتلاء و امتحان کا سخت نازک دور تھا "سردن" کے پاؤں پھسل گئے اور راس زہر کے گلاس کو جس کا لازمی اور آخری نتیجہ یہی ہونے والا تھا کہ مسلمانوں سے آخری شعائر و احکام کی قدر و منزلت، اسلامی معتقدات، ملت کی امتیازی خصوصیات اور مغربی تہذیب و تمدن کے تخیلات ایک ایک کر کے رخصت ہو جائیں۔ غرض مسلمانوں نے اس زہر کے گلاس کو شربت روح افزا سمجھ کر غٹ غٹ پی لیا۔ ہندوستانیوں کے دماغی چشمے خشک کیے جانے لگے! اور وہ تعلیم جس سے" ملک و ملت کی بہبودی اور ملک کے نوجوانوں کی اعلیٰ تربیت ہوتی تھی فنا کی گئی۔ اور "اسلامی مدرسۃ العلوم" کے ذریعہ یہ ہمدردانہ آواز بلند ہوئی کہ رفتار و گفتار نشست و برخاست خوراک و پوشاک غرض ہر شعبۂ زندگی میں انگریز جیسا بن جانے ہی میں مسلمانوں کی خیریت ہے۔

اس پُر آشوب و پُرفتن دور میں ان مسلمانوں کی مجلسوں میں جو جذبہ جہاد اور محبت وطن کو مسلمانوں کے سینوں میں زندہ رکھنا چاہتے تھے اور اس چنگاری کی چمک کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے پھر ایک بار اس سوال کی گونج اُٹھی کہ "مسلمان کیا کریں" اس دفعہ اس سوال ایک حل اور تجویز ہوا یعنی لارڈ میکالے کے تعلیمی نظام کے مقابلہ میں اسلامی نظام تعلیم کو قائم کرنے کی تجویز طے پائی۔ تاکہ الحاد و دہریت کے طوفانی سیلابوں سے ملت کی کشتی کو بچایا جائے۔ نیز عیسائی مشن کے مقابلہ میں تبلیغی کارروائی کرنے کی تجویز ہوئی۔ علمائے کرام کی جماعت حقہ نے حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہ کی رہنمائی و سرکردگی میں دار العلوم دیوبند کی بنیاد رکھی! اور اس کے علاوہ مراد آباد، گلاؤٹھی وغیرہ مقامات میں اس کی شاخیں قائم کی گئیں۔ اخلاص و للٰہیت کا وہ پودا آج ایک شجر عظیم ہے جس کے سایہ کے نیچے سمرقند و بخارا، آسام و برما، چین و ملایا، مصر و عرب غرض تمام دنیائے اسلام کا منتخب و ممتاز طبقہ قرآن و حدیث کی حقانی تعلیم سے سیراب ہو رہا ہے۔ اس مرد خدا اور مجاہد فی سبیل اللہ نے اس چشمۂ فیض کے جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ بہ نفس نفیس محنت مشقت اُٹھا اُٹھا کر عیسائی مشنریوں، بڑے بڑے پادریوں اور کٹر سے کٹر آریوں کے مقابلہ میں کامیاب تبلیغی جنگیں کیں، اور تحریر و تقریر ہر طریقہ سے اسلام کی حقانیت کو اقوام ہند پر ثابت کر دیا۔

الغرض اس جماعت حقہ نے مسلمانوں کو مغربی جراثیم کے مہلک اثرات سے محفوظ رکھنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ کچھ زمانہ بعد جذبہ جہاد کی دبی ہوئی چنگاری پھر بھڑکنے کو ہوئی۔ اور قاسم العلوم کی درسگاہ میں کتاب الجہاد کو زیر درس و مطالعہ رکھنے والوں نے انتم الاعلون کے بادۂ ناب سے پھر وہی نشہ پیدا کر لیا جس کے اُتارنے کے لیے لارڈ میکالے کی ترشی منتخب

کی گئی تھی۔ مسلمان سوچنے لگے کہ ذلت و غلامی کے اس طوق سے گلو خلاصی کی تدبیر کیا ہو۔ اب پھر حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ اور اُن کے شاگردان رشید کے سامنے یہی سوال پیش ہوا کہ "مسلمان کیا کریں؟" اور اسی سوال کا جواب تھا جو موتمر الانصار کے قیام اور حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مدظلہ کے نظارت المعارف اور درس قرآن کی صورت میں ظہور پذیر ہوا اور اسی سوال کا جواب تھا جو آج "ریشمی خطوط کی تحریک" کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ انگریزی حکومت کو محسوس ہوا کہ پھر مسلمان ترقی و تقدم کے میدان میں قدم رکھنے لگے ہیں پھر انھیں اپنی قوت و طاقت کا احساس ہونے لگا ہے۔ وہ ایک بار پھر اپنے منتشر اجزا کو ایک مرکز پر مجتمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُن کے ہوش و حواس پھر پریشان ہوئے چنانچہ اُنھوں نے اول تو شملہ میں بیٹھ کر اپنے چند ہمنواؤں کے ساتھ کانا پھوسی کرنے کے بعد ڈھاکہ میں مسلم لیگ بنوائی تاکہ مسلمانوں کی اس راہ میں ہمیشہ کے لیے روڑے اٹکائے جائیں اور بعد میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو امیر الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ۔ حضرت مولانا عزیز گل صاحب کاکاخیل زید مجدہ اور دوسرے ساتھیوں سمیت شریف مکہ کے ذریعہ گرفتار کرا کر مالٹا کے دور دراز جزیرہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ نیز دوسرے شاگرد جلاوطن کیے گئے۔ اور اس طرح جسمانی افتراق کرنے میں گورنمنٹ کو عارضی کامیابی ہوگئی۔ رولٹ ایکٹ کے "برطانوی تحفہ" میں ان حضرات کو مذہبی دیوانوں کا خطاب دیا گیا۔

مالٹا کے اس واقعہ کے بعد ۱۹۱۹ء میں جمعیت العلمائے ہند کا قیام ہوا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس جمعیت نے اس وقت سے لیکر آج تک ہر تحریک میں مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کی تحریک خلافت، موپلوں کے واقعہ، فتنۂ ارتداد، شدھ سنگھٹن، سارداایکٹ، اور جنگ آزادی ۳۰ء و ۳۲ء میں اس نے وہ کارنامے کر دکھائے جس سے حضرت شیخ الہند رح کی روح مبارک

جنت الفردوس میں باغ باغ ہوگئی ہوگی۔

ممکن ہے بعض قارئین کرام اس ساری داستان کو تطویل لاطائل سمجھ لیں۔ مگر میں بہ ادب عرض کروں گا کہ ان اجمالی اشارات سے جن کے اندر تفصیلات کے ہزار دفتر نہاں ہیں ہمیں فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ اور اس قصۂ پارینہ کے دہرانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ موجودہ مسلمان انہی کے ان تجربات ہی کی روشنی میں قدم آگے بڑھا سکتے ہیں ہم اپنی سیاسی و معاشرتی حیات کا فیصلہ کرتے وقت ترقی و تقدم کیلیے جو لائحۂ عمل بھی مرتب کرنا چاہینگے اُسکے لیے رہبر و رہنما کے انتخاب کا ایک صحیح معیار ان ہی واقعات کی روشنی میں ہمیں مرتب کرنا ہوگا ہمیں چاہیے کہ ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ حتمی فیصلہ کرلیں کہ انہی کے واقعات کا یہ تسلسل جس جماعت یا طبقہ کو قیادت و امامت کی سند عطا کرتا ہو اُسی کو اپنا پیشوا بنائیں۔ جو لوگ "مسلمان کیا کریں" کا جواب اُس وقت سے سوچ رہے ہیں جب سے ہماری مہربان گورنمنٹ نے ساحل ہند پر قدم رکھا ہے۔ اور اُس وقت سے اس سلسلہ میں گوناگوں تکالیف و مصائب اُٹھا رہے ہیں صرف وہی لوگ آج بھی اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ اگر ہمیں موجودہ مشکلات کا کوئی حل مل سکتا ہے تو وہ صرف اُن ہی کے دامن میں مل سکتا ہے۔ قوم کی کشتی کو خطرات و مہالک کے بھنور سے نکالا جاسکتا ہے تو ان ہی آزمودہ کار خداؤں کی مدد سے نکالا جاسکتا ہے جو پچھلی ایک صدی سے برابر خطروں اور مصیبتوں کے سیلاب میں مردانہ وار خود کو ڈالتے رہے ہیں جو قانون داں دماغ "علماء کے وقار کو ختم کردینے" کی تجویزیں سوچنے میں مصروف ہوں وہ قوم کی فلاح و بہبود کے لیے صحیح راستہ متعین کرنے اور اسلامی روایات و شعائر کو زندہ و بالا رکھنے کی خدمت کے قابل نہیں ہوسکتے۔ مسلمانوں کو ان سے یہ توقع ہرگز نہ رکھنی چاہیے۔

ہمیں اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ایک مرد مومن کے لیے مذہب ہی

سیاست ہے۔ مذہب ہی اقتصادی خوشحالی ہے، مذہب ہی آرام کی زندگی ہے۔ غرض مذہب ہی ایسی متاع گرانمایہ ہے جو ہر چیز سے مقدم و اولیٰ ہے! اور اس کے مقابلہ میں سب باتیں ہیچ۔ اگر مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی نصیب ہوئی شریعت مطہرہ کے جملہ احکام و قوانین کے اجراء و نفاذ کا مکمل اختیار حاصل ہوا امارت شرعیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ خدا کا یہ ابدی و فطری قانون عملاً ہندوستان کی سرزمین میں بالاتر کیا گیا تو یہی اصل مدعا اور ہمارا مقصد اعلیٰ ہے اقتصادی خوشحالی، روٹی کا مسئلہ بعد کی اور ضمنی چیزیں ہیں! ایک مسلمان کا مسلمان ہونے کی حیثیت سے انھیں مطمح نظر بنانا یقیناً ایک خطرناک غلطی اور مضر ترین اقدام ہے۔ مگر ایسی مکمل آزادی کیسے حاصل ہوگی اور اس کے لیے مسلمان کیا کریں؟ یہ غور طلب ہے۔

گزشتہ تقریباً ایک صدی کے عرصہ میں ہمارے اکابر عظام نے جو بھی تحریک شروع کی اس مقصد کو لیکر شروع کی کہ اس سرزمین میں الٰہی قانون اور آسمانی دستور کا اجراء ہو۔ اور اس اجنبی شہنشاہیت کے بجائے ایک ایسی حکومت قائم ہوجائے جس میں ہم مسلمان اپنی تہذیب و ثقافت اپنی زبان مخصوص مذہبی مراسم، اسلامی اور مذہبی علوم و روایات، معابد و مدارس کو نہ صرف یہ کہ محفوظ رکھ سکیں بلکہ ہر شعبہ میں بیش از بیش ترقی کرنے کے لیے ہمیں بہترین مواقع میسر ہوسکیں۔ ہاں ہر زمانہ میں حالات و ماحول کے پیش نظر مختلف نوع کی تحریکوں کو اٹھایا گیا ہے۔

آجکل ہندوستان میں مختلف جماعتیں اور مجالس مسلمانوں کی خیر خواہی اور قیادت کے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ موجود ہیں اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے مسلم لیگ کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں جو آج کل کانگریس کو پچھاڑنے کی قسم کھائے بیٹھی ہے اس لیے کہ کانگریس نے گستاخی کرکے وزارت کی کرسیوں سے اُسے نیچے کیوں گرادیا! ورنہ کانگریس سے صلح نہ کرنے کا ادنیٰ بہانہ عجیب و غریب شرط ہے کہ اُسے ۹ کروڑ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کیوں تسلیم

نہیں کیا جاتا۔ لیگ کے ۳۲ سالہ زمانۂ حیات میں کوئی ایسا واقعہ ہمیں نظر نہیں آتا کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت کے اس نے مسلمانوں کی کوئی ایسی رہنمائی کی ہو جس سے ملک و مذہب کی مکمل آزادی کو کوئی دور کا تعلق بھی ہو۔ علاوہ ازیں جبکہ اس کے ارباب بست وکشاد خود اصول مذہب سے بیگانے، اسلامی تہذیب و معتقدات سے قطعاً ناآشنا اور شرعی شان و شکوہ سے قطعاً دور ہیں، مغرب کی ہر چیز کے دلدادہ اور فریفتہ ہیں تو پھر مسلمانوں کے مستقبل کا اہم اور شاندار لائحہ عمل ایسے دماغوں سے مرتب کرانا یقیناً غلطی ہے۔

کبھی مجلس اتحاد ملت کا نام بھی سننے میں آتا ہے۔ مگر اس کی وجہ پیدائش اور زمانۂ اعمال سے جو لوگ واقف ہیں وہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ "برعکس نہند نام زنگی کافور"۔ مسلمانوں کی ایک منظم وفعال جماعت کے شیرازہ کو منتشر کرنے کی سعی کرنا، ملت کی طاقت کو پارہ پارہ کرنا، بزرگوں کی پگڑیاں اچھالنا، غلط فہمیوں کا جال پھیلانا، اس جماعت "اور اس کے رہنمائے محترم" کے چند ممتاز کارنامے ہیں۔

ایک جماعت کانگریس کی طرف مسلمانوں کو بلانے والی اُن قوم پرور احباب کی ہے جن کی لغت میں غلط فہمی سے قومیت کے معنی یہ لکھے ہوئے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے ایسا متحدہ محاذ قائم کرنا چاہیے جس میں مسلمانوں کیلیے اپنے مذہب، مخصوص امتیازات اپنی قوم کیلیے جائز حقوق کا مطالبہ سب کچھ فرقہ پروری اور مذموم ہے۔ اور جسطرح ہم میں سے بعض حضرات انگریز کیطرح نصرانی ہو جاتے ہیں اُسیطرح یہ حضرات گاندھی جی کے ایسے عاشق زار بن گئے ہیں کہ انکی ہر ادا پر اپنی تہذیب و تمدن شعار و آئین سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں اور مجھے نہایت رنج و افسوس کے ساتھ مجبوراً لکھنا پڑتا ہے کہ ہماری بدقسمتی سے ہمارے صوبہ کے بعض مقتدر لیڈر بھی اسی طبقہ و جماعت میں ایک ممتاز فرد کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ اور سرحد کے خالص اسلامی اور مذہبی صوبہ میں اسلامی رنگ سے رنگے ہوئے

نوجوانوں کو گاندھی جی اور ہندوستت کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں اور آشرم کا انتظام ہو رہا ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پس ایسے مسلمانوں کے ہاتھ میں اس مقصد اعلیٰ کے واسطے جدوجہد کرنے کی زمام قیادت دینا یقیناً غلطی ہوگی جو مذہب کو قومیت سے نہ صرف یہ کہ مؤخر درجہ دیتے ہیں بلکہ اس بحث ہی کو تنگ نظری، دقیانوسیت اور اصول قومیت کے منافی قرار دیتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!۔

ان جماعتوں کے علاوہ جمعیت علماء ہند اور مجلس احرار اسلام دو فعال و کارکن جماعتیں ہیں جو کہ دراصل ایک ہی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں۔ خود مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی صدر مجلس احرار نے ایک دفعہ تقریر میں فرمایا تھا کہ "جمعیۃ العلماء سول اور احرار اس کی فوج ہے" اور واقعۃً دونوں اسلام کے ایک ہی مقصد عزیز کو سامنے رکھ کر شاہراہِ آزادی پر تیز قدمی سے گامزن ہیں۔ اور درسگاہ قاسمیہ کے تربیت یافتہ حضرات دونوں مجلسوں میں روح کی طرح زندگی پیدا کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ اگر ایک طرف شیخ الاسلام امیر الہند حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ جیسا ماہر اسرار شریعت و طریقت، مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب جیسا جید و مستند عالم دین، حضرت مولانا عزیز گل صاحب کاکاخیل جیسا صائب الرائے نڈر مخلص و بے لوث جرنیل، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جیسا مرد باعمل اور فصیح البیان خطیب اور دوسرے مقتدر علماء جمعیت کی گاڑی کو نہایت کامیابی سے چلا رہے ہیں تو دوسری طرف امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری جیسے امیر البیان اور نیک سرشت و باعمل واعظ، مولانا حبیب الرحمٰن جیسے بیباک، حق گو اور چودھری افضل حق صاحب جیسے صحیح مدبر و مفکر اور مولوی مظہر علی صاحب اظہر جیسے قانون دان سے مجلس احرار کی رونق و زینت ہے۔

مختصر یہ کہ ان دونوں جماعتوں ہی سے ہم قوم کی فلاح و بہبود، مذہب و ملت کی سربلندی اور اعلاء کلمۃ اللہ کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ ان اکابر کی صد سالہ تاریخ جن کی آغوش میں انھوں نے تربیت پائی اور خود ان کے ماضی قریب کے شاندار کارنامے ہمیں آمادہ کر رہے ہیں کہ اس نظام کو زیادہ مضبوط و مستحکم کر کے ان ہی کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور اپنے لیے ایک ایسا نتیجہ خیز طریق کار سوچ لیں جس سے ہمارا مستقبل روشن و منور ہو جائے۔

لیکن اگرچہ احرار کی جرّار اسلامی فوج جمعیت العلماء کے مشوروں اور ہدایات سے کبھی بھی مستغنی نہیں ہوئی اور نہ جمعیت العلماء کے ارباب اختیار نے کبھی ان کی رہنمائی و رہبری قبول کرنے سے دریغ کیا مگر ضابطہ و قواعد کی رو سے ان دونوں کے درمیان باہمی تعلق و مواصلت کی نوعیت ابھی تک طے نہیں ہوئی! اور آج وقت ہے کہ دونوں ہر حیثیت سے ایک محاذ ہو کر مسلمانوں کی ڈوبتی ناؤ کو منجدھار سے نکالنے کی تدبیریں سوچیں۔ لیلائے مذہب کے وصال کے لیے "مذہبی مجنون" ہی صحرا نوردی اور جادہ پیمائی کی ہمت و استقامت رکھتے ہیں اور انہی کے قدم ان خارزار وادیوں میں گامزن ہو سکتے ہیں اسلیے قوی امید ہے کہ اس قرآن السعدین سے قوم کے لیے نہایت خوشگوار نتائج اور مفید ثمرات حاصل ہو سکینگے۔ مسرت کا مقام ہے کہ جمعیۃ العلماء ہند کے ترجمان خصوصی موقر اخبار الجمعیۃ کے مقالہ افتتاحیہ (۲۰/۲۴ دسمبر) میں بھی اسی خیال کا اظہار کیا گیا ہے جس کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مبارک و مسعود گھڑی جلد آنے والی ہے جس کے بعد اسلامی ہند کا مطلع مصائب اور پریشانیوں کے بادلوں سے صاف ہو جائے گا۔

جمعیۃ العلماء ہند کا عظیم الشان اور اہم ترین سالانہ اجلاس عنقریب دہلی میں منعقد ہونے والا ہے۔ اس لیے مؤدبانہ عرض ہے کہ حضرات علماء کرام اور رہنمایان احرار کو اس

مسئلہ پر خاص طور سے سوچنا چاہیے۔

ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی صدر مجلس احرار نے دارالعلوم دیوبند میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:۔

"مسلمانوں میں کارکنوں کی کوئی کمی نہیں مگر کوئی صحیح رہنما نہیں ملتا جتنے لیڈر نظر آتے ہیں یہ سب ورکر تو ہیں مگر حقیقی رہنما نہیں۔ رہنما تو شیخ الہند تھے جن کے پاس ایسی روحانی طاقت موجود تھی جس سے وہ ہر ایک کے دل سے انانیت کا کانٹا نکال سکتے تھے"۔ میں کہتا ہوں کہ اگرچہ ہماری بدقسمتی سے آج ہم میں شیخ الہندؒ نہیں رہے مگر کیا انھوں نے اپنے حقیقی جانشین امیر الہند مولانا مدنی مدظلہ کو ہماری رہنمائی کے لیے نہیں چھوڑ دیا ہے؟ اس لیے چاہیے کہ اُن کی ذات اقدس اور زندگانی کو غنیمت سمجھ لیں۔ اور اُن کی زیر قیادت یہ متحدہ محاذ قائم کریں۔ دونوں جمعیتوں کے باضابطہ ایک نظام ہوجانے کے بعد نہایت سرگرمی اور جانفشانی سے تمام ہندوستان کے ہر قصبہ وشہر میں علماء اور عام مسلمانوں کی ماتحت جمعیتیں قائم کرنے کی جدوجہد شروع کر دینا چاہیے۔

آج ہم مسلم لیگ کی صف میں ایسے حضرات کو بھی دیکھ رہے ہیں جن کے اخلاص اور جذبہ صادق پر قطعاً کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا اور اُن کی عمر کے گزشتہ دور شاندار کارناموں اور حقیقی خدمات ملک وملت میں گزر گئے ہیں جس کی بناء پر آج بھی اُن کی ہستیاں قابل احترام ہیں لیکن افسوس ہے کہ یہ بیچارے میٹھی میٹھی دلفریب باتوں سے مرعوب ہو کر "قائد اعظم" کے دکھائے ہوئے سبز باغ کے تصور سے اپنی پرانی روش اور رفقا کو چھوڑ کر آنکھیں بند کیے نئی راہ پر نئے قائد کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔ افہام وتفہیم سے اُن کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس بارے میں اُن کے خلوص نیت کی بناء پر کامیابی کی امید ہے۔

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک + بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائیگی +

مسلمانوں کی اس منظم و متحدہ طاقت کے مقابلہ میں نہ برطانیہ کی شہنشاہیت ٹھہر سکتی ہے اور نہ گاندھی جی اور مہاسبھائی ہندوؤں کو یہ جرارت ہو سکے گی کہ آنے والے ہندستان کا خاکہ مرتب کرتے وقت مسلمانوں کے معاملہ میں اپنی گھناؤنی ذہنیت کا مظاہرہ کر سکیں کانگریس اور کانگریسی حکومتیں اپنے ہر اقدام میں ہماری خواہشات کا احترام کرتے ہوئے قدم اُٹھائیں گی۔ ورکنگ کمیٹی میں ہماری آواز موثر ہو گی۔ آج مسلمانوں کی طرف سے "ہائی کمانڈ" کی جو بے توجہی اور بے اعتنائی ہے وہ بھی دور ہو سکے گی اور ہمارا تعاون حاصل کرنے کے لیے ہماری رائے کو بھی وقعت دی جائے گی۔ اور جس طرح اب گاندھی جی ہمارے پیش کردہ فارمولا کو فراموش کر رہے ہیں پھر شاید یہ صورت پیش نہ آسکے گی۔

ہاں اس سلسلہ میں اُن کانگریسی حضرات کو جو قومیت کا ایک غلط تصور قائم کر کے مذہبی معاملات کو پس پشت ڈال رہے ہیں قومیت کا صحیح مفہوم سمجھا کر اپنے ساتھ ملانا بھی نہایت ضروری ہے تاکہ اُن کا یہ جذبہ عمل صحیح طور پر استعمال ہو کر مسلمانوں کی تقویت کا باعث بنے اور یہ لوگ کانگرس کی مجلسوں میں ایک مسلمان ہونیکی حیثیت سے شریک ہو کر اپنے ہر جائز مطالبہ کو منوانے کیلیے خم ٹھونک کر مقابلہ کرنیکو "فرقہ پرستی" نہ سمجھیں اور اس سلسلہ میں اغیار کے طعنوں کی پروا نہ کریں۔

پھر یہ صحیح ہے کہ اس کارروائی کے بعد کسی فرنگی یا انگریزی محل سے برطانیہ کے رجسٹرڈ جمعیۃ علماء کے ڈنکے پر بھی بڑے زور سے چوب پڑیگی اتحاد ملت کانفرسونکی دھوم دھام بھی شروع ہو جائیگی۔ مسلم لیگ کی غوغا آرائی سے بھی آسمان ٹوٹنے لگے گا لیکن الحق یعلو ولا یعلی سیلاب کا یہ شور و فغان چند ہی روز میں ختم ہو جائیگا حق و صداقت کا یہ نرم خرام دریا اپنی عظمت و شکوہ کے ساتھ برابر جاری رہیگا۔ سیاح الدین کاکاخیل (پشاور)

مسلمانوں کا نصب العین۔ مذہبی نقطۂ نظر سے حقیقی نصب العین اس ملک میں مسلمانوں کا یہ ہے کہ ہندوستان کو پورے طور پر دارالاسلام بنانے کی سعی کریں۔ اور اگر بحالت موجودہ یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم حسب استطاعت نیم دارالاسلام بنائیں یعنی عملی جد وجہد سے ہندوستان کے دستور حکومت کے بنیادی اساس میں مذہبی تحفظ کو ان تشریحات کے ساتھ داخل کرائیں جنکی جمعیۃ علماء ہند نے اپنے مطالبہ میں تصریح کردی ہے تاکہ مسلمان عملی طور پر مذہبی حیثیت سے اپنی انفرادی اور آپس کی اجتماعی زندگی میں غیر شرعی زندگی گزارنے کی معصیت سے محفوظ ہو جائیں۔

مسلمانوں کی شرعی تنظیم کی نوعیت۔ اسی مقصد کے لیے امارت شرعیہ کا قیام سنہ ۱۹۲۰ء میں عمل میں آیا کیونکہ اسلامی اصول پر صحیح تنظیم کی صورت صرف امارت شرعیہ ہے جس کا بنیادی اصول ارباب حل وعقد کا امیر منتخب کرنا ہے اور تمام مسلمانوں کا اس کے احکام پر سمعاً وطاعت کرنا ہے۔ اس کے احاطۂ عمل میں مسلمانوں کے تمام مذہبی وسیاسی و اقتصادی امور داخل ہیں۔

امارت شرعیہ کی حیثیت انجمن کی نہیں ہے جیسا کہ اور انجمنیں ہوتی ہیں کہ اس کے ممبر وغیرہ ہوتے ہیں بلکہ اس کی صورت وہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ کتاب وسنت اور آئین اسلامی کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ اس محکمہ کو چلایا جائے اور قومی محصول ادا کیا جائے اور نقیب وسردار کا انتخاب کیا جائے اور ہر مسلمان امارت شرعیہ کی ایک کڑی بن جائے کیونکہ اسکے ذریعہ سے صحیح معنوں میں مذہبی وقومی حقوق کی حفاظت ہو سکے گی اور مسلمان خوشبخت

(پراگندگی) کے گناہ سے محفوظ رہینگے اور شرعی طریقہ پر زندگی کی منزلیں بھی طے کریں گے۔

جمعیۃ العلماء کا نصب العین۔ جمعیۃ العلماء مسلمانوں کی ایک مذہبی جماعت ہے جسکے احاطہ عمل میں سیاسی امور داخل ہیں اور وہ سیاسی امور میں مذہبی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر رہنمائی کرتی ہے۔ جمعیۃ العلماء کی تشکیل رواجی اصول سے انجمن سازی کے طریق پر مبنی ہے اسکی مجلس عاملہ منتظمہ میں دو حصہ علماء کا ہوتا ہے اور ایک حصہ غیر علماء کا اور چونکہ علماء کی تعداد کمیٹی میں غالب ہے اسلیے بحکم "للاکثر حکم الکل" اسکا نام جمعیۃ علماء ہے ورنہ حقیقت میں یہ ایسی جماعت ہے جسمیں عالم و غیر عالم دونوں داخل ہیں۔ اور اسکے عام ممبر غیر عالم حضرات غیر محدود تعداد میں ہو سکتے ہیں اگرچہ عام ممبر ابھی تک بہت تعداد میں نہیں بنائے گئے ہیں مگر اب جمعیۃ علماء بہار الحمد للہ اس کام کو شروع کر چکی ہے۔

جمعیۃ علماء اور امارت شرعیہ کا باہمی تعلق۔ صوبہ بہار میں چونکہ امارت شرعیہ قائم ہو چکی ہے اس لیے مسلمانوں کے تمام اندرونی و جماعتی کام عملی طور پر امارت شرعیہ کے سپرد ہیں۔ اور جمعیۃ علماء بہار کا فریضہ ہے کہ وہ امارت کے اعلان و پروگرام کو کامیاب کرے اور اسی کے ساتھ ملکی سیاسیات میں جمعیۃ علماء بہار اور جمعیۃ علماء ہند کے اصول و ہدایت کے ماتحت براہ راست حصہ لے کیونکہ مسلمانوں کے حقوق و مذہب کی حفاظت ملکی سیاسیات میں براہ راست عملی جد و جہد ہی سے ہو سکتی ہے۔

جمعیۃ علماء کا طریقہ کار۔ جمعیۃ علماء کا طریقہ کار یہ ہے کہ مسلمانوں کی مخصوص جماعت مستقلاً موجود ہو جو سیاسیات میں حصہ لے۔ اور وہ وطنی و سیاسی جماعت یعنی کانگریس کے اندر بھی اپنے آدمیوں کو بھیجے تاکہ وہ لوگ مسلمانوں کے مذہبی و قومی مفاد کے لیے جو امر ضروری ہوں وہ کانگریس کے پلیٹ فارم پر بیان کر کے کانگریس کو غلط روی سے روکنے کی کوشش کرے

یہی نقطۂ نگاہ ہے جو جھیرہ کے اجلاس میں جمعیۃ العلماء نے پاس کیا ہے اور اس تجویز کے ماتحت جمعیۃ علماء کے جتنے عام ممبر ہوں گے وہی لوگ کانگریس کے ممبر ہوسکتے ہیں۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جمعیۃ العلماء کا کوئی ممبر ایسا نہ ہو جو کانگریس کا بھی ممبر نہ ہو۔ اور جو کانگریس کا ممبر ہو وہ جمعیۃ علماء کا ممبر بھی ضرور ہو۔ جمعیۃ علماء بہار نے اس مقصد کے لیے فارم رکنیت وغیرہ چھپوا لیے ہیں اس کا دفتر مونگیر میں منتقل ہوگیا ہے مولانا سید منت اللہ صاحب ایم۔ایل۔اے اس کے ناظم ہیں۔ جمعیۃ العلماء کے ممبر بنانے کے لیے فارم و رسید وہاں سے طلب کیے جاسکتے ہیں اور مقامی کانگریس کمیٹیوں سے کانگریس کمیٹی کے فارم و رسید لیے جاسکتے ہیں۔ جن مسلمانوں کو جمعیۃ علماء کا ممبر بنائیں ان کو کانگریس کا بھی ممبر بنائیں۔ اس طریقۂ عمل سے مسلمانوں کی جماعتی و سیاسی پوزیشن مضبوط و محفوظ ہو جائے گی۔

مسلم لیگ کی پالیسی و عملی جد و جہد۔ باقی رہی مسلم لیگ تو وہ بھی اگرچہ مسلمانوں کی جماعت ہے جو ۱۹۰۶ء سے قائم ہے لیکن عام مسلمانوں سے اس کی روشناسی ۱۹۳۷ء میں ہوتی ہے۔ اس کے متعلق چند امور قابل توجہ ہیں۔

اول یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور ہے ان کے اکثر افراد ہندوستان کی عملی سیاسیات سے بہت دور ہیں اس لیے مسلم لیگ سے یہ توقع نہیں کہ وہ برطانوی حکومت سے مقابلہ کے لیے کوئی عملی جد و جہد کرے گی۔

دوسرے یہ کہ اس کے قائدین و زعماء اسلام کے اصول و فروع سے بہت دور ہیں اس لیے یہ جماعت مذہبی تحفظ بھی نہیں کرسکتی۔

تیسرے یہ کہ سب سے بڑی نہایت غلط پالیسی اس کی یہ ہے کہ اس کے کارکن بلکہ ذمہ دار حضرات ان تمام علماء کو جو مذہب و ملت کے خادم ہیں اور برطانوی شہنشاہیت کے خلاف

جہادِ حریت کی راہ میں ایثار و قربانی کی راہ پر تقریباً ایک سو سال سے گامزن ہیں نہایت ہی بُرے بُرے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور عوام مسلمین کو ایسے علماء سے بدگمان کرکے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے علاوہ خالص برطانوی پالیسی پر دانستہ و نادانستہ عمل کر رہے ہیں کیونکہ برطانیہ کی پالیسی ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ اُن تمام علماء کو جو ہندوستان کو دارالاسلام بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں یا برطانیہ سے جنگ کرتے رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں انکو مسلمانوں ہی کے ذریعہ بدنام کرنے کی کوشش کرے۔ اس طرح پر ہندوستان میں سب سے نام نہاد مذہبی جھگڑے اور فرقہ بندیاں انگریزوں کی پیدا کردہ ہیں۔ بدقسمتی سے آج انگریزوں کی یہ خدمت مسلم لیگ کے نام سے خود مسلمان انجام دے رہے ہیں۔

چوتھی بات یہ کہ مسلم لیگ بجائے اس کے کہ برطانوی حکومت کے خلاف صف آرا ہونے کی تیاری کرتی (جس نے مسلمانوں کی حکومت چھینی اور ان کو تباہ و برباد کیا۔ اور ممالک اسلامیہ پر قبضہ کیا) اس نے یہ غلط پالیسی اختیار کی ہے کہ عام ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عام نفرت پھیل جائے اور عوام آپس میں سر پھٹول کریں۔ مسلمان ہندوؤں کا مقاطعہ کریں اور ہندو مسلمانوں کا اور اس طرح ملک میں بدامنی پھیلے اور اس کا انجام یہ ہے کہ برطانوی حکومت کا ہاتھ مضبوط ہو۔ اور وہ صوبجات کی اس نام نہاد خودمختاری کو بھی چھیننے کے لیے تیار ہو جائے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رو سے ہندوستان کو دیا گیا ہے جو صرف جمعیۃ علماء اور مجلس احرار پنجاب اور سرحد کے سرخپوش مسلمان مجاہدین کی سرفروشیوں کا ثمرہ و نتیجہ ہے۔ اور جب یہ خودمختاری واپس ہو گی تو صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ پنجاب اور صوبہ بنگال کی خودمختاری بھی چھن جائے گی جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے جس سے مسلمانوں کا سخت نقصان ہو گا۔

اور سرحد کے غیور اور بہادر پٹھانوں کا گلا گھٹ جائے گا۔ان حالات اور اس غلط پالیسی کے ساتھ مسلم لیگ سے کیا توقعات ہو سکتی ہیں۔ اور جب توقع ہی نہ رہی تو اس کی شرکت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا لیکن جو مسلمان اس میں شریک ہونا چاہتے ہیں ان کے خلاف کوئی ایسی کارروائی بھی نہیں کر سکتے جو اسلامی اصول کے منافی ہو۔

اس سلسلہ میں ایک بات یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ کانگریس کوئی خالص اسلامی جماعت نہیں ہے اس لیے اس سے یہ توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ وہ ٹھیک ٹھیک اسلامی اصول کے مطابق کام کریگی بلکہ ارباب حل و عقد ایسے وسیع الخیال نہیں ہیں کہ وہ اپنی ہر پالیسی میں اسلامی نقطہ نگاہ کو فراخ دلی و فراخ حوصلگی کے ساتھ پیش نظر رکھیں گے۔ اگر کوئی مسلمان ایسا خیال کرے تو سراسر حماقت پر مبنی ہوگا۔ اس لیے اگر کانگریس کی بعض کارروائیاں ہمارے نقطہ نگاہ کے خلاف ہوں تو ہم کو اس کارروائی سے بیزاری تو ضرور ظاہر کرنی چاہیے لیکن کانگریس کو چھوڑنا نہ چاہیے کیونکہ کانگریس کی شرکت اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت ہے اور وہ جماعت جو بھی کرے گی اسلامی اصول کے مطابق کریگی۔ بلکہ اُس کی شرکت محض اس وجہ سے ہے کہ برطانوی سیاست کا مقابلہ کرنا مسلمانوں کا فریضہ ہے اور وہ فریضہ کانگریس میں شرکت کے ساتھ موثر طریقہ پر ادا ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، نیز یہ کہ کانگریس میں شریک ہو کر مسلمان اپنی مذہبی و قومی حقوق کے تحفظ و نگہداشت کی کچھ تدبیریں بھی کر سکتے ہیں اور کچھ نہ کچھ اپنا اثر ڈال سکتے ہیں بلکہ کانگریس کے اندر بھی مسلمان اپنے حقوق کے لیے جنگ کر سکتے ہیں اور اپنی اُس خالص جماعت سے جو کانگریس سے باہر مستقلاً موجود ہوگی اس کے ذریعہ اپنی جنگ کو قوی کر سکتے ہیں۔

الغرض کانگریس یا کانگریس کے ارباب اقتدار کی غلط کاریوں سے بیزار ہو کر مسلمانوں کو علیحدگی اختیار کرنا دانشمندی کے خلاف ہے کیونکہ اصل منزل پر پہونچنے کے لیے درمیانی

منزل میں اس قسم کے واقعات کا پیش آنا ناگزیر ہے۔

برخلاف اس کے جو خالص اسلامی جماعت ہو اور جو اسلام و مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی مدعی ہو اسکی غلط کاری اور بے راہ روی ناقابل برداشت ہے کیونکہ جس مقصد کے لیے خالص اسلامی جماعت کی ضرورت ہے جب اُسی مقصد کی بیخکنی وہ جماعت کرتی ہو تو ایسی جماعت کو قوت پہونچانا اسلامی اصول اور مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہونچانا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ لیگ اور کانگریس کی غلط کاریوں کے برداشت و عدم برداشت میں جو نکتہ ہے اُس کو بہت سے لوگ نہیں سمجھتے ہیں اور ناسمجھی سے کہا کرتے ہیں کہ جب کانگریس میں باوجود غلط کاریوں کے شریک ہو سکتے ہیں جس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے تو پھر مسلم لیگ میں کیوں نہیں شریک ہو سکتے ہیں جو خالص مسلمانوں کی جماعت ہے۔

(مولانا محمد سجاد، نائب امیر شریعت صوبہ بہار و اڑیسہ)

جو لوگ خالص قوم پرستی کے شیدا ہیں وہ "مسلمان کیا کریں"؟ کے جواب میں کانگریس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ کانگریس قومی ادارہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے اس کا اپنا اس کی جدوجہد اور اس کی ساری کوشش ہندوستان کے ہر فرقہ کی بھلائی کے لئے ہوئی ہیں اس کی موجودہ حالت بنانے میں ہر فرقہ کا حصہ رہا ہے۔ اس نے اپنی ان تھک کوشش اور جدوجہد سے یہ صلاحیت پیدا کر لی ہے۔ کہ برطانوی شہنشاہیت کا قلع قمع کر دے۔ لہذا بہتر یہی ہے۔ کہ آزادی کی جنگ اسی کے جھنڈے کے نیچے لڑی جائے۔ اور اس کی خامیوں کو دور کرنے کی بھی یہی صورت ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کے اندر داخل ہوں۔ لیکن ایک دوسرے گروہ کے نزدیک مسلم لیگ نجات کا ذریعہ ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق کانگریس ایک ہندو جماعت ہے۔ اس کا پروگرام مسلمانوں کے لیے زہر قاتل ہے۔ اور جو مسلمان اس کے اندر شامل ہیں وہ غدار ہیں۔ کانگریس قومی جماعت نہیں ہے بلکہ قومی ادارے کے نام پر خالص فرقہ پروری کے خواب دیکھ رہی ہے۔ ایسی صورت میں ان کے نزدیک مسلمانوں..........

کا اس کے اندر شامل ہونا قطعی بے سود ہے۔ ان کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ یہ الگ لیگ کے جھنڈے تلے اپنی تنظیم کریں۔

چونکہ کانگریس کے اندر ہندو پیش پیش رہے لہذا کانگریس کو ہندو جماعت کہا جا رہا

ہے۔ مسلمان انفرادی حیثیت سے تو ہمیشہ اس میں شامل رہے لیکن ایک جماعت کی حیثیت سے کبھی نہیں رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس پر مکمل قبضہ ہندوؤں ہی کا ہے اور اس پر ہندو ذہنیت غالب ہے۔ اس ذہنیت کا سب سے بڑا مظاہرہ زبان کے مسئلہ میں نظر آتا ہے۔ سنسکرت نوازی کا یہ عالم ہے کہ برہمنیت کو نئے انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔ زبان کے اس مسئلہ نے قوم پرست مسلمانوں کے پاؤں بھی ڈگمگا دیئے ہیں اور کانگریس شبہ کی نظر سے دیکھی جانے لگی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا اس ذہنیت کو دور کرنے کی کوئی ترکیب ہے بھی یا نہیں۔ اس کیلئے دو صورتیں دو جماعتوں کے ذریعہ پیش کی جا رہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کانگریس کے اندر کثیر تعداد میں شامل ہو کر اس کے پلیٹ فارم سے ان بے عنوانیوں کے خلاف آواز بلند کی جائے اور دوسری یہ کہ مسلمان اقلیت میں ہیں (اور ہمیشہ رہیں گے) لہذا یہ کانگریس میں بھی اقلیت ہی کی حیثیت رکھیں گے۔ ان کی آواز کانگریس کے اندر بھی اکثریت کی آواز کے نیچے دب کر رہ جائے گی اس لئے مسلمانوں کی فلاح اسی میں ہے کہ یہ علیحدہ اپنی تنظیم کریں اور اپنی سیاسی جماعت علیحدہ قائم کر کے کانگریس سے برسرپیکار رہیں۔

موجودہ حالت میں جبکہ کانگریس برطانوی ہند کے کثیر حصہ پر حکومت کر رہی ہے۔ مسلمانوں کو اس سے یہ شکایت ہو گئی ہے کہ یہ ہندو راج قائم کر رہی ہے۔ ممکن ہے کہ عام ہندوؤں کا خواہ وہ کانگریسی ہوں یا غیر کانگریسی یہ خیال ہو کہ کانگریسی حکومت ان کی حکومت ہے۔ لیکن مبالغہ آمیز پروپگنڈے سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ کانگریسی حکومت جان بوجھ کر مسلمانوں کے حقوق نہیں کچل رہی ہے۔ اور اسکی وہ خامیاں جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے دور کر دینے کے قابل ہیں ابھی تک اس وجہ سے موجود ہیں کہ مسلمانوں کی

آواز کانگریس کے اندر قطعی نہیں ہے اپنے اپنے نظریئے علیحدہ ہیں لیکن اس سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صائب نظر یہی ہے کہ مسلمان کانگریس کے اندر کافی تعداد میں شامل ہوں اور اس کی خامیوں کو دور کریں — اب یہ کہنا کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مسلمان اس ادارے میں بھی اقلیت ہی کی حیثیت رکھیں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کانگریس کی مخالفت کرکے بھی ان کی اکثریت نہیں ہو جائے گی اور نہ اس طرح مسلمان اپنے حقوق کو برطانوی شہنشاہیت کی امداد کے بغیر محفوظ رکھنے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں۔ بلکہ مخالفت اور عدم اتحاد کی وجہ سے فرقہ وارانہ نفاق کی خلیج اور بھی زیادہ بڑھتی جائے گی۔ اور اشتراک عمل ہونا غیر ممکن ہو جائے گا۔ یہ صورت نہ صرف ملک کے لئے نقصان رساں ہوگی بلکہ مسلمانوں کے لئے بھی ضرر سے خالی نہ ہوگی۔ ہم کو ایک لمحہ کے لئے بھی اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ انگریز ہندوؤں سے کہیں زیادہ ہندوستانی مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ انگریزوں ہی نے یہاں مسلمانوں کی حکومت کو تباہ و برباد کیا اور ان ہی کی کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ مسلمان ترقی کی منزل پر نہ پہونچنے پائیں۔ لہٰذا ان کی حکومت کو یہاں قائم رکھنا اور اس جماعت سے لڑتے رہنا جو اس کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے مسلمانوں کا طرزِ عمل نہیں ہونا چاہیے۔

لیگ کے بعض رہنماؤں کی عملی سرگرمی اور ان کے جذبۂ ایثار و قربانی کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقہ کی بھلائی کے لئے کوشش کر رہی ہے۔ لیکن عام مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا رہی ہے۔ اس کے برعکس اسکی ساری جدوجہد مسلم

عوام کو انقلابی رجحانات کیطرف سے روکنے میں صرف ہو رہی ہے۔ مسلم حقوق وغیرہ کے معنی یہ ہیں کہ اوپر کے چند گنے چنے مخصوص مفاد رکھنے والے امیروں رئیسوں، اور نوابزادوں کے حقوق بچائے جائیں اور عام مسلمانوں کو جن کا تعلق ان حقوق سے قطعی نہیں ہے اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ یہ ان مسلمانوں کے حقوق کو زمانہ کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے میں مدد دیں لیگ کو واقعی اگر مسلمانوں کے ہر طبقہ کا خیال ہوتا تو یہ ان مسلمانوں کو گالیاں نہ دیتی جو اس کے ساتھ تو نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کا درد ان کے دلوں میں لیگ والوں سے زیادہ ہے اور جو ایثار و قربانی کے مجسمے ہیں یہ ان کے ساتھ اتحاد عمل کرتی۔ اور مسلمانوں کو ایک صحیح راستہ دکھلاتی۔

بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم لیگ یا مہا سبھا کیطرف سے کانگریس کی مخالفت ایک حد تک طبقاتی جنگ کو ظاہر کر رہی ہے۔ مسلمانوں کا نچلا متوسط طبقہ چونکہ نادار بھی ہے اور انقلابی رجحانات بھی رکھتا ہے لہذا یہ کانگریس کو ایک حد تک انقلابی جماعت سمجھ کر اس میں داخل ہونا چاہتا ہے اور اپنے ساتھ اس کثیر آبادی کو بھی لے جانا چاہتا ہے جو یہ بھی نہیں جانتی کہ دو وقت بھر پیٹ کھانا کس کو کہتے ہیں اور سارے بدن کو ڈھاکنا کس کا نام ہے۔ اس کے برخلاف مستقل حقوق رکھنے والے زمیندار اور سرمایہ دار اور ان کے ساتھ اونچے متوسط طبقہ کے خوشحال لوگ لیگ کے پرستار ہیں اور اپنی جماعت کو مضبوط کرنے کے لئے نچلے متوسط طبقہ اور عوام کو ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ عوام کی بیداری کیلئے ضروری ہے کہ ملک میں ایک سے زائد سیاسی ادارے ہوں۔ اس لحاظ سے کانگرس اور لیگ کے پروگرام عوام کو بیدار کرنے کا باعث ہوں گے۔ جب عوام میں صحیح بیداری ہو جائیگی۔ تو یہ خود ہی اس جماعت کی طرف رخ کریں گے جو ان کی زیادہ سے زیادہ چارہ سازی

کرسکے گی۔ اس وقت لاکھ کوشش کے باوجود مذہبی جذبات سے کھیلا نہیں جا سکتا۔
سر دست نچلے متوسط طبقہ کے رویہ پر ہندوستان کی فلاح کا بہت کچھ دارومدار ہے۔
اگر یہ رجعت پسندی کا شکار ہو گیا تو کچھ عرصہ کے لئے ہمیں ہندوستان کی قسمت پر رونا ہی پڑیگا۔
اور اگر یہ وقت کے ساتھ چلا اور اپنی روائتی انقلابی ذہنیت کو کام میں لاکر اس نے
انتہا پسندی کا ساتھ دیا تو ہمارا مستقبل نہایت ہی شاندار رہے۔ عوام سے قریب تر نچلا متوسط
طبقہ ہی ہے اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کا کام اسی کا ہے۔ کانگرس کی موجودہ خامیوں
کو دور کرنے میں بھی یہی طبقہ پیش پیش رہے گا۔ لہذا مسلمانوں کے اس طبقہ کا فرض ہونا
چاہیئے کہ ہر انتہا پسندی کا ساتھ دے۔ جتنی جماعتیں ہیں ان میں کانگرس ہی کے
اندر یہ اپنے رجحانات کے مطابق کام کر سکتے ہیں۔ اب رہا مسلم لیگ کا سوال
سو ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ اپنے موجودہ بے عمل سرمایہ پرست
ڈکٹیٹروں کے زیر سایہ انقلابی جماعت بن ہی نہیں سکتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کا
ایک بارسوخ سرمایہ پرست گروہ ہر حال میں اس کے ساتھ شامل رہے گا۔ اسکے مفاد کا تقاضہ یہی
ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ وقت کی حالت کو مدنظر رکھ کر جذبات کے دائرہ سے نکل کر حقائق کو
دیکھنے کی کوشش کریں۔ اور ایسا راستہ اختیار کریں جو اطمینان وسکون کی زندگی کا ضامن
ہو۔ جب تک ہم لیگ کو انقلاب پسند جماعت بناتے ہیں (اگر واقعی یہ کبھی بن سکے گی اس
اسوقت تک تو دنیا بہت کچھ بدل چکی ہو گی۔ پھر کیوں نہ مسلمانوں کی وہ کثیر آبادی جو مفلس اور
بے یار و مددگار ہے ابھی سے انقلابی جماعت کیطرف رخ کرلے اور ان چند مٹھی بھر افراد
کے دام فریب سے خود کو چھڑا لے جنہوں نے اپنا ٹھکانا فرقہ پرست جماعت کے سایہ تلے
بنالیا ہے۔ اور جن کی زندگی یکسر راحت وعیش ہے۔

"احمد کریم"

اس سلسلہ میں اب تک جن مضمون نگاروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں سے بعض کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہوجانا چاہیئے، اور بعض لوگ مسلم لیگ میں شرکت کے موید ہیں۔ رایوں میں اختلاف ہمیشہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ہر مسلمان کانگریسی کی رائے اس کے خلاف ہوگی، کانگریسی مسلمان کہتا ہے کہ مسلم لیگ صحیح معنوں میں برٹش لیگ ہے اور مسلم لیگ کی آواز ہے کہ ——

کانگریس نے برٹش گورنمنٹ سے تعاون کیا ہے اول الذکر جماعت کے دلائل ہیں کہ لیگ کا سربرآوردہ گروہ خان بہادروں، اور سروں پر مشتمل ہے، اور مکمل آزادی کا رزولیوشن پاس کرنے سے پہلے یہ گروہ وائسرائے اور گورنروں کی چوکھٹ پر جبیں سائی کرنے گیا تھا۔ نیز تعلقہ دار و زمیندار اپنی حفاظت کے لئے لیگ میں شریک ہیں۔ ان کو اقتصادیات سے کوئی واسطہ نہیں، اور نہ ملک کی کے افلاس سے کوئی ہمدردی۔ لیگ والوں کا دعویٰ ہے کہ کانگریس کے وزرا، وزیر ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ تاوقتیکہ وہ گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا حلف نہ اٹھاتے۔ نیز یہ کہ اس جماعت کا مقصد صرف یہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ کے ماتحت رہ کر حکومت کا کاروبار چلایا جائے۔ مکمل آزادی سے کانگریس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان دلائل کے مقابلہ میں کانگریس لیگ کو طعنہ دیتی ہے وہ کہتی ہے کہ

لیگ بے عمل جماعت ہے۔ اور اس کے سامنے کوئی عملی پروگرام نہیں ہے یہ مسلم وزارتیں بنا کر برٹش سامراج کو قوت پہنچانے کا کام کرے گی۔ لیگ کہتی ہے کہ کانگریس برٹش حکومت کے ماتحت رہ کر ہندو راج قائم کرے گی اسکو مسلمان کی فلاح سے کوئی سروکار نہیں علاوہ ازیں اہل فرنگ کہتے ہیں کہ دیہات سدھار اور کاشتکار کی جو اسکیم ہے۔ وہ صرف اس لئے ہے کہ چونکہ دیہاتوں کی ۵۰ فیصدی آبادی ہندو ہے جب اس آبادی کو آرام و راحت پہنچا کر دماغ کو سکون کی طرف لایا جائے گا تو اس کی تنظیم ہندو راج کے قائم کرنے میں سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوگی۔

دلائل تو دونوں کے اٹل ہیں۔ اور یہ صحیح ہے کہ ہندو لیڈر کی ذہنیت کم ازکم یہ ہے کہ اس کی قوم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچے یہ اپنے ذاتی مفاد پر اپنے قومی فائدے کو ترجیح دیتا ہے اس میں ایثار و قربانی کا مادہ پیدا ہوگیا ہے لیکن مسلمان لیڈر کی ذہنیت اپنے ذاتی مفاد ہی تک محدود ہے اس کی قوم دوزخ میں جائے یا جہنم میں اسکو اپنے "حلوے مانڈے" سے واسطہ۔ میں مجبور ہوتا ہوں یہ یقین کرنے پر کہ بجز مسٹر جناح کے ان کے ہمنواؤں میں تمام کے تمام برٹش مشین کے پرزے ہیں اور کانگریس کے اعلیٰ ارکان میں بجز جواہر لال نہرو کے سب کے سب ہندو راج کے سپاہی ہیں لگی لپٹی کہنا تو بزدلوں کا کام ہے میرے نزدیک ابھی تک ہندوستان کا کوئی فرد قومی لیڈر نہیں۔ ایسا جیسا ہٹلر، مسولینی اور مصطفےٰ کمال پاشا دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ اور نیتیں بخیر نہیں، اور تاوقتیکہ کوئی ایسا پیدا نہ ہوگا، مکمل آزادی ناممکن ہے۔ لیکن سوال یہ ہے جب تک کہ ملک کی یہ حالت ہے مسلمان

کیا کریں؟ میری رائے میں جماعتی طور پر ان کو جلد سے جلد کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیئے، دیر کرنا یقیناً مسلمانوں کے لئے مہلک ترین ہے۔ مگر یہ خیال لیکر شریک نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ مسلمان کمزور ہیں، مفلس ہیں اور اقلیت میں ہیں۔ یہ خیال کرنا چاہیئے کہ ہندو اکثریت ان کو پیس ڈالیگی۔ اور نہ یہ کہ کانگریس ہندو کی ملکیت ہے بلکہ اگر قرآن پر یقین ہے، اگر خدائی طاقت کو مانتے ہو تو اپنے دماغوں پر اور اپنی روحوں پر اس آیت کو مسلط کر لو، اور اس نشانی کو لباس زیب تن کر کے شریک ہو جاؤ کہ

کَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً (اکثر ایسا ہوا ہے کہ بہت تھوڑی تعداد رکھنے والی جماعتیں خدا کے حکم سے بڑی تعداد رکھنے والی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں۔

اگر آج مسٹر جناح کی جگہ پر میں ہوتا تو مسلمانوں سے کہتا کہ تم ایک دم کانگریس کے قلعہ میں گھس جاؤ۔ اور اگر میں گاندھی کے مقام پر ہوتا تو تمام ہندوؤں کو حکم دیتا کہ مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس پر چھا جاؤ۔ مسلط ہو جاؤ۔ اور قبضہ کر لو۔ اگر آج تمام کانگریسی ممبر لیگ میں گھس پڑیں یا تمام لیگی کانگریس میں داخل ہو جائیں تو "من و تو" کا جھگڑا ہی مٹ جائے۔

ڈاکٹر محمد اشرف صاحب فرماتے ہیں کہ۔

"ہمیں جداگانہ اسلامی سیاست سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لینا چاہیئے کہ یہ عقیدہ غیر تاریخی و فاسد ہے" لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال مصلحت کوشی سے وابستہ ہے، ایسی مصلحت جو ضعف ایمان کے عجز اور اقلیت کے خوف سے متاثر ہوا۔ غالباً آپ نے موجودہ توہم پرستی کو مذہب اسلام سمجھ کر اسلامی سیاست سے بیزاری

کا اظہار فرمایا ہے، کاش کہ آپ کی نگاہ "کم من فئۃ" کے فلسفے پر ہوتی۔ یا ابتدائے اسلام کی تاریخ پر یا آخر اسلام کے واقعات پر کہ قلیل ترکوں نے مٹے ہوئے ترکوں نے، تباہ و برباد ترکوں نے، ان ترکوں نے جو بے آب و دانہ تھے، بوسیدہ وردیوں میں، خستہ حالی میں، افلاس کی منزل میں، اس وقت جبکہ ترکی زمین کا ذرہ ذرہ وقفِ مایوسی تھا، اور اس حال میں جبکہ برطانیہ اسکو اپنی سیادت میں لینے کا نقشہ تیار کر چکا تھا، کمال پاشا نے کسطرح یونانی اور برطانوی فوج کے چھکے چھڑا دئے تھے! اور کس طرح لائڈ جارج کی فوج کو ترکی سرزمین سے بھگا دیا تھا۔ یہ واقعہ تو ۱۹۲۰ء ہی کا ہے، کچھ دور کا نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف کا مدعا غالباً اسلامی تاریخ ہند سے ہوگا۔ سو اس باب میں موصوف خلافت ایجی ٹیشن کے جس نے کانگریس میں جان ڈالی، خود ہی قائل ہیں۔ پھر یہ کہ انسان جلد جلد سانس لیتا ہے، پر زمانہ صدیوں کے بعد سانس لیتا ہے۔ ممکن ہے مستقبل قریب میں آپ کا غیر تاریخی خیال، تاریخ کے صفحات پر رونما ہو جائے لاتقنطوا من رحمۃ اللہ۔

"امام اکبر آبادی"

ایک مدت سے یہ بحث جاری ہے کہ مسلمان کیا کریں؟ مجھے اس کا افسوس ہے کہ تاحال یہ بحث کچھ بہت زیادہ معنیٰ خیز ثابت نہیں ہوئی البتہ ہر سیاسی اور معاشرتی نقطۂ نظر کا اظہار ضرور ہو گیا۔ اس میں مسلم لیگ کے حامی بھی تھے اور مخالف بھی۔ کانگریس کے ماننے والے بھی تھے معترض بھی اور منکر بھی "خیر الامور اوسطھا" کے مصداق انتہائی عالمانہ انداز میں جمعیت احرار کا پروگرام بھی پیش ہوا اور تلخ تجربہ کی بنا پر بعض اصحاب نے اس کی تردید بھی کی۔ آخر میں یہ سوال پھر اپنی جگہ رہا کہ مسلمان کیا کریں؟ بعض لوگ جب زندگی کے حقائق اور زندہ سوالوں سے منہ چھپانا چاہتے ہیں تو خوشنما تصورات اور گذری ہوئی دنیا کے غیر تاریخی خواب میں پناہ لیتے ہیں چنانچہ بعض لوگوں نے اسلام کا نصب العین اس انداز سے پیش کیا گویا کہ کوئی اچھوتی بات پیش کر رہے ہیں۔ اور انداز تحریر کچھ ایسا ہے جیسے کوئی شاعر ایک خوبصورت مطلع کہہ کر داد چاہتا ہے یا ایک واعظ گنہگاروں کے مجمع میں اپنی خطابت کے زور سے اپنی روحانی رفعت منوانا چاہتا ہے۔ مجھے اس قسم کی تحریرات سے صرف ایک شکایت ہے کہ لکھنے والے مسلمان ملت کے موجودہ تقاضوں اور محرکات و سوالات سے قطعاً بے خبر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا ارزاں اور فرسودہ وعظ کبھی ایک عملی اور زندہ پروگرام یعنی اجتماعی لائحہ عمل کی صورت اختیار نہیں کرتا۔

اس بحث سے ایک سبق ضرور ملا۔ وہ یہ کہ جب کبھی آپ مسلمانوں سے بہ حیثیت

ملت مخاطب ہوں گے اور اُن کے معاشری سوالات کو مجرد صورت میں اور نظری اعتبار سے دیکھیں گے یہی خلفشار رہے گا مسلمان سیاسی اور معاشی اعتبار سے دورِ حاضر اور ہندوستان میں نہ ایک قوم ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک مذہبی ملت ہیں لیکن معاشری اعتبار سے مختلف مفاد اور بعض اوقات متضاد اور متصادم جماعتوں سے مرکب ہیں چنانچہ اُن کے معاشری محرکات بھی مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر یوں دیکھیے کہ مسلمانوں میں مختلف پیشے اور حیثیتوں کے لوگ ہیں مسلمان کسان بھی ہیں صنعتی مزدور بھی ہیں اور دستکار بھی۔ بہت سے فاقہ مست ہیں۔ اوپر کے طبقہ میں اعلیٰ حضرت نظام دکن اور آغا خاں سے لیکر دس اور پندرہ روپیے کے سرکاری ملازم بھی ہیں۔ لاکھوں بے روزگار ہیں۔ اب یہ بحث ظفر علی خاں صاحب کے انداز میں نہ کیجیے کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں یہ صورت نہ تھی۔ ایسی شکل نکالیے کہ خلافت راشدہ جیسا نظام حکومت دوبارہ قائم ہو جائے اور اس پر سنجیدگی سے سوچیے کہ تاریخی صورت اُس جدوجہد کی فی زمانا کیا ہو سکتی ہے جو خلافت راشدہ جیسا نظام قائم کر دے۔ اور یہ بحث یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس سے آگے بڑھ کر غور فرمائیے کہ آج ہماری جدوجہد کی وہ کیا صورت ہے اور وہ کون سے سماجی طبقے ہیں جن کے ساتھ اشتراک عمل کرنے سے ہم اس منزل مقصود کی طرف دو قدم بڑھ سکتے ہیں؟

اس مختصر سی بحث سے دو ناگزیر نتائج نکلیں گے:۔

اول یہ کہ مسلمان یا کسی قوم کے افراد کو عمل پر مائل کرنے یا آزادی کی جدوجہد کے لیے اُبھارنے کی غرض سے مناسب سماجی اور اقتصادی تحرکات کی ضرورت ہے جو باعتبار طبقات مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً سیاسی آزادی صرف غریب مسلمان کا مطالبہ ہو سکتا ہے۔ امیر اور صاحب ثروت مسلمانوں کو تحریک آزادی سے اُن معنوں میں سروکار نہ اُن کے

عمل میں وہ شدت نہیں ہو سکتی جو فی الجملہ مفلوک الحال مسلمانوں کو ہو گی۔

دوم یہ کہ ہمارے مذہبی اور تاریخی نصب العین کی تکمیل اس پر منحصر ہے کہ اس جدوجہد کا مستقبل میں، اور بالخصوص اس وقت کیا رنگ روپ ہوتا ہے؟ فرض کیجیے کہ مسلمانوں کی معاشری تحریکات میں صاحب امارت لوگ حاوی رہیں تو ظاہر ہے کہ آزادی کی تحریک نہ ابھرے گی نہ آگے بڑھ کر مسلمان عوام کی اقتصادی اور معاشری زندگی بدل سکے گی اور نہ نئی روحانی قدریں پیدا ہوں گی جو ایک انصاف پرست اور حقائیت پسند حکومت کا نقشہ پیش کریں جس کی آخری منزل میں خلافت ارضی کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔

اس مختصر سی گفتگو کے بعد اب پھر سوال کو دہرائیے کہ مسلمان کیا کریں تو اس کی دو شکلیں معلوم ہوں گی۔ (۱) غریب مسلمان کیا کریں اور اگر وہ کچھ کریں تو (۲) اہل دولت کا کیا رُخ ہو گا؟ ظاہر ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے عمل کا سوال نہیں ہے۔ وہ برابر اپنے مفاد اور اپنے موجودہ اقتدار کے تحفظ کی فکر میں ہے اور عوام کی شعوری سماجی تحریک ان کی مرضی کے خلاف اور بڑی حد تک ان کے مفاد اور اقتدار سے متصادم ہو گی۔

ہمیں اس کا اندازہ ہے کہ جب ترک موالات میں عامۃ المسلمین برطانوی سامراج سے برسرپیکار ہوئے تو اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کا کیا رخ تھا۔ دور کیوں جائیے ہمیں گذشتہ عام انتخاب میں بھی اس کا اندازہ تھا کہ خود یہ حضرات مسلم لیگ کے خلاف اپنی "متحدہ" اور "زراعتی" پارٹیاں بنا رہے تھے اور آج بھی فوراً مسلم لیگ سے جدا ہو جائیں گے اگر اُن کے مفاد اور اقتدار کو صدمہ پہونچنے کا امکان بڑھنے لگے، تو پھر ہمیں سوچنا پڑے گا کہ عام مسلمان آزادی کی طرف کیوں کر بڑھیں؟ اور ہمارے اس سوال کی کہ "مسلمان کیا کریں"، اب صورت یہ ہو جائے گی کہ "چونکہ غریب مسلمانوں کے لیے برطانوی استعمار

سے گلو خلاصی کے بغیر ایک ترقی پسند حکومت بنانا اور اپنی زندگی کو بہتر کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے وہ کیا صورت ہے کہ عام مفلوک الحال مسلمان اس ملک کو آزاد کرنے والی طاقتوں پر اپنا اثر ڈال کر آزادی اور انقلاب کی منزل کو قریب لے آئیں اور صحیح جمہوری حکومت قائم کر لیں؟ ۔

واقعہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے سامنے یہ سوال آج سے نہیں سو برس سے پیش رہا ہے جب سے برطانوی استعمار کی تباہ کاریوں نے اُن کی زندگی کو ناقابل برداشت بنا دیا ہے اور اُنھوں نے اس کی تدبیریں بھی کیں ہیں۔ متعدد بار بغاوتیں کی ہیں۔ مذہب کی آڑ لے کر انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ بھی اُبھارا ہے۔ حسب مقدور لڑائیاں بھی لڑی ہیں اور بدرجہ مجبوری سازشیں بھی کی ہیں مگر اس حقیقت کو وجدانی اور شعوری طور پر ذہن نشین کر لیا ہے کہ برطانوی نظام حکومت کے ہوتے ہوئے صحیح انسانی زندگی (چاہے اسے قومی کہیے یا مذہبی) اُن کے لیے ناممکن ہے۔

ایک طرف جس طرح مسلمانوں کا جذبہ ہے دوسری طرف مفلوک الحال غیر مسلم بھی اس میں شریک ہیں اس لیے کہ برطانوی استعمار کی تباہ کاریاں بڑی حد تک اور کم از کم موجودہ دور میں مذہبی اور نسلی امتیازات سے بے نیاز ہیں۔ مسلمانوں کی طرح ہندو سکھ جاٹ مرہٹے (یعنی عام لوگ اور چھوٹی حیثیت کے آدمی) اسی جذبہ سے متاثر تھے اور ہیں۔ اُنھوں نے بھی بغاوتوں اور جنگوں میں شرکت کی ہے بلکہ سیاسی قربانیوں میں وہ مسلمانوں سے نسبتاً بہت زیادہ رہے ہیں۔ اسی مشترکہ سامراج دشمن جذبہ نے کانگریس کی تحریک کو پروان چڑھایا ہے اور چاہے کانگریس میں کتنی ہی خرابیاں کیوں نہ ہوں وہ اس تاریخی فریضہ کو ادا کرتی ہے اور یہ بھی تاریخی واقعہ ہے کہ اس فریضہ کو کوئی مسلمان یا ہندو یا سکھ جماعت تن تنہا نہ ادا کرتی ہے

نہ بہ حالت موجودہ ادا کر سکتی ہے۔

اس لیے بحث یہ نہیں ہے کہ ہم کانگریس سے علیحدہ ہو کر یا خود کو کانگریس میں رکھ کر مسلمانوں کی جداگانہ استعمار دشمن تنظیم کریں۔ یہ خیال بنیادی طور پر فاسد ہے۔ اور گزشتہ ۲۰ سال کا سیاسی تجربہ اس کی تردید کرتا ہے۔ ضرورت البتہ یہ ہے کہ مسلمان کانگریس کے استعمار دشمن جذبہ کو آگے بڑھائیں یعنی سیاسی اقدام کرنا سیکھیں اور ملک کو آزاد کرانے کے ذمہ دار بنیں۔ ہم فرقہ پرستی کی حدود میں رہ کر یا مسلمانوں کی محدود تنظیم کو سامنے رکھ کر ملک کو آزاد کرانے کا کام انجام نہیں دے سکیں گے۔ نہ سیاسی اقدام کی صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلم لیگ کے علاوہ خود حریت پرست مسلمان مثلاً ارکان مجلس احرار و جمعیۃ العلماء آج سیاسی اقدام اور ملک کی عنان سیاست ہاتھ میں لینے سے ایسے ہی معذور ہیں جیسے جمعیت خلافت کبھی تھی۔ سوال کی نوعیت استعمار دشمن ہے اس لیے اس کا حل از روئے ملت و فرقہ وارانہ تنظیم ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ ہماری کسی قسم کی سیاسی تنظیم اس میں مدد دے سکتی ہے۔ گو مسلمانوں کی عمومی معاشی اور تعلیمی ترقی اس کے لیے بہتر فضا پیدا کر سکتی ہے۔

ہر تنظیم کا خاکہ کسی منشا کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ تبلیغ۔ اصلاح و تعلیم سب باتیں ایک بنیادی خیال کے تابع ہوتی ہیں۔ فرض کیجیے کہ آپ آزادی اور انقلاب کے سوال کو ایک مفلوک الحال مسلمان کی نگاہ سے اور سیاسی سطح پر دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ ہم کس حد تک اور ہمارے اہل ملک بالخصوص نفسیاتی اعتبار سے کافی آگے آ گئے ہیں مگر سر دست عوام کے اسقدر آگے بڑھ جانے سے اعلیٰ طبقوں میں ایک خاص قسم کی گھبراہٹ اور سامراج پرست حلقوں میں بدحواسی طاری ہے جس کے مختلف مظاہر ہیں۔ کانگریس کے

بعض حلقوں میں (یعنی اعلیٰ طبقہ کے ترجمانوں میں) اعتدال پرستی نمایاں ہے۔ جاگیرداروں نے ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ اسی خوف سے بنائی ہے اور خود غیر مرتب انقلابی دماغ ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں۔ چونکہ وزارت سے تھوڑی سی طاقت ملی ہے اس لیے اعلیٰ طبقہ اپنی سرمایہ دارانہ "تعمیر" میں مصروف ہے۔ کارخانے اور کمپنیاں اور اپنی ضروریات کا اُردو ہندی ادب بنا رہا ہے۔ اور عوام کی انقلابی تحریک و رجاعتی تنظیم کو دبانے میں ہر قانونی اور غیر قانونی طریقہ کو کام میں لا رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔

تو پھر ان مخصوص حالات میں تنظیم سے کیا مراد ہے اور غریب مسلمان کیا کریں؟

تاریخی راہ صاف ہے یعنی وہ مزدور و کسان اور طالب علم و بے روزگاروں کی حیثیت سے منظم ہوں اور جلد منظم ہوں تاکہ اپنی تنظیم کے ساتھ ملک و ملت کو (جس میں اُن کی اکثریت نمایاں ہے) آزادی اور فوری جد و جہد کا پروگرام دیں۔ چنانچہ کانگریس کا سوشلسٹ اور کمیونسٹ طبقہ (جو ان کا واحد عملیانہ ترجمان ہے) اس کام میں مصروف ہے۔ البتہ وہ محسوس کرتا ہے کہ شہر کے لوگ (بالخصوص مسلمانوں میں) ابھی تک مسلم عوام پر حاوی ہیں اور اُن کے ذہن میں مسلم تمدن اور زبان و کلچر کے مٹانے کا خوف پیدا کر دیا گیا ہے اور اقلیت کے تحفظ کا اُنھیں برابر خیال ہے بلکہ یہ خیالی اس درجہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے کہ اب شہر کے اوسط اور اعلیٰ طبقہ کے سامنے استعماری جد و جہد کا نقشہ اوجھل ہوتا جاتا ہے۔ ان انقلاب پسندوں کو اس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ ہندو اعلیٰ طبقہ اصلاح پسندی کے ساتھ ہندو مذہب اور ہندو تمدن کے دقیانوسی اور خطرناک بلکہ جارحانہ تصور میں مبتلا ہے یا کم از کم اس تصور سے فائدہ اُٹھانے کا آرزومند ہے۔ مگر وہ ان تحفظات کی دائمی حیثیت اور "آریہ تہذیب" کے خوابوں کو حقیقت ماننے سے قاصر ہیں۔ اُن کے نزدیک

یہ دونوں مطالبے ہماری موجودہ سماج کے صحیح اقتصادی اور زندہ سماجی تقاضوں سے بےخبری کا دوسرا نام اور سیاسی پستی کی دلیل ہے جس کے لیے وہ برطانوی سامراج اور اُس کے حلیفوں یعنی جاگیری طبقوں اور رجعت پسندوں کو دعا دیتے ہیں ہندو مسلم فرقہ پرستی ایک ہی پستی کے دو رخ ہیں اور دونوں ہندو مسلم عوام کے مفاد اور محنت کشوں کے انقلاب کے دشمن ہیں۔ اس لیے جہاں تک میرے ذاتی عقائد کا تعلق ہے میں چاہتا ہوں کہ عام لوگ اس عام سوال سے کہ "مسلمان کیا کریں" ہٹ کر اب اس سوال پر غور کریں کہ "غریب مسلمان کیا کریں اور کیسے کریں؟" اور میرا صاف جواب یہ ہے کہ غریب مسلمان آزادی کی تحریک کو بڑھانے کے لیے کانگریس میں شریک ہوں تاکہ غیر مسلم عوام سے مل کر استعمار دشمن جد و جہد کو مضبوط کریں اور اس کے ساتھ اپنی جماعتی تنظیم پر متوجہ ہوں۔ بلکہ وہ ادبیات اور آئینی دور میں اپنی جماعتی تنظیم پر زور دیں کیونکہ ملکی آزادی کا انقلابی جذبہ اب اسی تنظیم میں پوشیدہ ہے۔

مگر یہ بات ذہن نشین کرنے کے لیے سیاسی اور حکیمانہ مزاج پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جو لوگ اقلیت اور تحفظات یا زبان اور کلچر کے سوالات پر زور دیتے اور اسی راگ کو الاپتے رہتے ہیں شاید انھیں اس کا احساس نہیں کہ وہ اپنے طرز عمل سے استعمار، اصلاح پسندی اور ہندوستانی اعلیٰ طبقہ کے مفاد کے سب سے بڑے دوست بن جاتے ہیں، اس لیے کہ وہ مسلم عوام کو جماعتی تنظیم اور انقلابی جد و جہد کی تیاری سے باز رکھتے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ یہ سوالات بے بنیاد ہیں میں ہندی پرستی اور ہندو نوازی کا بھی منکر نہیں ہوں۔ مگر میری گزارش یہ ہے کہ یہ متوسط طبقہ کی سیاسی رجعت پسندی کے مظاہر ہیں اور اس کا صحیح جواب اُردو کی حمایت یا تحفظات نہیں بلکہ انقلابی سیاست پر زور دینا ہے۔ فرقہ پرستی تاریخی اعتبار سے اس دور

میں صرف ایک پردہ کا کام دے سکتی ہے حقیقت نہیں بن سکتی۔ اس لیے ہندو تعصب کے مقابلہ میں آپ ردعمل میں پڑ کر اس تعصب کی سیاسی اور معاشری بنیادوں کو مضبوط نہ کیجیے۔ البتہ اس کا حل سوچیے۔ مگر یہ خوب یاد رکھیے کہ انقلاب سے پہلے کوئی دیرپا حل مشکل ہے۔ انقلاب کے بعد عوام کی نئی ضرورتوں کے لحاظ سے ادب، زبان، قانون اور خود نظام حکومت اپنا چولا بدلیگا۔ اور اس وقت تک بقول غالب یہ عالم رہے گا کہ ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

رہا یہ سوال بلکہ یہ حقیقت کہ مسلمان اس سیاسی خیال کو اپنا نہیں کہہ سکتے اور مذہب اور فرقہ پرستی کے نام پر ہی اُبھر سکتے ہیں۔ یہ نتیجہ اس کا ہے کہ گزشتہ ۲۰ سال میں ہماری اسلامی تحریکات خالصتاً جذباتی اور ہنگامہ پرست رہی ہیں اور اُنھوں نے مسلمانوں کا خمیر ہنگامہ پسند اور مرثیہ خواں بلکہ اعجاز طلب بنا دیا ہے۔ اپنی مایوسی میں آج وہ مصطفےٰ کمال اور کل مہدی علیہ السّلام کے منتظر ہوں گے یعنی زندہ سیاست سے جو خود اعتمادی کا جذبہ فروغ پاتا ہے اُس سے محروم ہوتے جائیں گے۔ کاش ہمارے انجمن ساز لیڈر اب بھی ارزاں مذہبی اور فرقہ پسندی کے غیر تاریخی محرکات کو چھوڑ کر صحیح سیاسی اور اقتصادی بنیادوں پر کام شروع کردیں مگر اس کے لیے اُنھیں گزشتہ ۲۰ سال کی سیاست اور سیاسی روایات کو بھلانا پڑے گا۔

(ڈاکٹر محمد اشرف پی۔ ایچ۔ ڈی)

مجھے ڈر ہے کہ عنوان بالا "مسلمان کیا کریں" مصرع طرح بن کر نہ رہجائے ہم صرف اس کی تضمین آرائی اور مضمون بندی کی دھن میں کیا کریں کیا کریں کی رٹ لگاتے رہیں اور کچھ کرنیکا وقت ہاتھ سے نکل جائے، خدا وندان کانگریس نے اپنا اعتماد ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے، کانگریس کے بڑے بڑے فدائی مسلمان انکے طرز عمل سے شاکی اور متنفر ہو رہے ہیں لیکن اس مخلصانہ تنفر و شکایات کی کوئی معقول پروا نہیں کیجا رہی ہے اہل کانگریس اپنی محدود کامیابی کی بلندیوں سے اتر کر اپنے سابق ہمنوا مسلمانوں کی آواز پر نیک نیتی سے غور کرنے کیلیے تیار نہیں، ایک معنوی اور صوری اکثریت کا اقلیت سے اتنا مجرمانہ تغافل روا رکھنا، ملک کی انتہائی بدقسمتی اور تاریخ عالم کا نہایت افسوسناک کارنامہ ہے مسلم لیگ نے شور و ہنگامہ اور ہجوم و اجتماع میں بیشک کافی ترقی کر لی ہے لیکن ملک یا قوم کے سامنے ابتک اسکا کوئی تعمیری پروگرام نہیں، اور نہ ہی مستقبل قریب میں ایسی توقع کی جاسکتی ہے، امت مسلمہ کی اجتماعی روح اس وقت ہر گذشتہ زمانہ سے زیادہ تنظیم و اقدام کی محتاج ہو رہی ہے لیکن افسوس ہے کہ لیگ کا دماغ اس احساس سے قطعاً عاری ہے، پنجاب کا نقال صوبہ لیگی اخبارات کے شور و شغب کے باوجود لیگ کی برکات سے یکسر محروم ہے احرار، خاکسار، اتحاد ملت، وغیرہ جماعتوں کے قائد ممکن ہے کہ تمام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتے ہوں لیکن ان کے "عوام" اپنے محدود حلقوں سے باہر کسی مسلمان کو "مسلمان" سمجھنے کے لیے بمشکل تیار ہوں گے عوام کی باہمی نفرت کے ذمہ دار بھی ایک حد تک ان کے قائد ہی

سمجھے جا سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ سوال نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمان کیا کریں؟ بلکہ سوال یہ ہونا چاہیے کہ

"مسلم رہنما کیا کریں؟"

حقیقت یہ ہے کہ کچھ کرنا یا نہ کرنا عوام کے بس کی بات نہیں۔ ہمارے عوام میں ایثار و قربانی اور اتباع و فدا کاری کا کو رانہ جذبہ موجود ہے۔ تحریک خلافت کے آغاز سے اسوقت تک مسلمانوں نے ہر تحریک میں جانسپاری و زرپاشی کا توفیق سے بڑھکر ثبوت دیا ہی ہجرت افغانستان کے لیے اپنے آپ کو غیر مآل اندیش لیڈروں کے حوالے کر کے تباہی و ذلت قبول کی معرکہ کشمیر میں ملک کے ہر گوشے سے لبیک کی صدا بلند ہوئی۔ بیرون ہند کے اسلامی علاقوں پر اغیار کی دست برد سے ہندی مسلمان من حیث القوم سب سے زیادہ متاثر ہوتا رہا، سب سے آخر میں معرکہ مسجد شہید گنج میں ہمارے نہتے سپاہی حکومت کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

کیا یہ سب واقعات شہادت نہیں دے رہے کہ مسلمان سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہے لیکن صحیح معنوں میں کوئی لیڈر موجود نہیں۔ آجتک انکی باگڈور ایسے لوگونکے ہاتھ میں رہی ہی جنھوں نے ان کی بے اندازہ قوت کو محض اپنی نادانیوں یا خود غرضیوں کی بھینٹ چڑھایا، اور صرف تخریب کے ہنگامے برپا کیے اور اسلیے اسوقت ضرورت دردمند، صاحب عزم اور ذی اثر لیڈروں کی ہے جو ہمارے موجودہ خود غرض، جاہل ناعاقبت اندیش تنگ نظر اور بے خبر لیڈروں کے سامنے قرآن مجید کی یہ آیات پیش کریں۔

لا تنازعوا فتفشلوا	آپس میں جھگڑا نہ کرو ایسا کروگے تو تمہاری
وتذھب ریحکم	طاقت سست پڑجایگی اور ہوا اکھڑ جائے گی

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا — متحد ہو جاؤ اور پھوٹ نہ ڈالو،
لاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا — ان لوگوں کے مانند نہ ہو جاؤ جو واضح نشانیاں
من بعد ما جاء ھم البینات — آجانیکے بعد بھی اختلافات میں الجھ گئے

کیا یہ آیات کریمہ صرف عوام کو سنانے کے لیے ہیں؟ کیا ان مواعظ کو پیش کرنیوالے ان کی تفسیر بیان کرنے والے علماء کرام اور قائدین عظام ان کے مکلف نہیں؟

مسلمانو اٹھو اور ان "معلمین اتحاد" سے اتحاد کی بھیک مانگو! ان کو ترک شقاق کے لیے مجبور کر دو — کانگریس، لیگ، احرار وغیرہ جماعتوں کے مخلص و مؤثر رہنماؤں کے سامنے دست بستہ عرض کرو کہ خدارا اپنی خود غرضانہ خودداریوں کی جھوٹی بلندیوں سے اتر کر قوم کے لیے کوئی متحدہ راہ عمل تجویز کیجئے۔ آپ لوگوں کی متفقہ آواز پر قوم لبیک کہیگی خود غرض ابن الوقت پیشہ ور اخبار نویسوں اور لیڈروں کا شور واویلا بے اثر ہو جائیگا اور نہ وہ دن دور نہیں ہے جب۔

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اعاذنا اللہ منہ

عرشی امرتسری

ختم شد

۱۲ فروری ۱۹۳۹ء

حلقۂ ادب کی خصوصیات

حلقۂ ادب علم و ادب کی خدمت اور زبان اُردو کی اشاعت کرتا ہے

حلقۂ ادب علم و ادب کے نہایت اعلیٰ مجموعے شائع کرتا ہے

حلقۂ ادب کی مطبوعات نہایت عمدہ حسین اور ارزاں ہیں

حلقۂ ادب کا مقصد خود غرضانہ نفع بازی اور کسب زر نہیں ہے۔

حلقۂ ادب کی شرائط تجارت تمام پبلشرز کے مقابلہ میں جاذب ہیں

حلقۂ ادب اسکولوں، کالجوں اور لائبریریوں کو خاص رعایات دیتا ہے

حلقۂ ادب ہندوستان کے تمام پبلشرز کی مطبوعات مہیا رکھتا ہے

حلقۂ ادب کے معاملات صاف اطمینان بخش اور دیانتدارانہ ہیں

حلقۂ ادب۔ لکھنؤ

باہتمام محمد عبد القدوس پرنٹر

سلطانیہ برقی پریس نظیر آباد لکھنؤ میں چھپا